نوائے ادب

(ششماہی)

جلد ۳۷ : شمارہ ۱

اپریل ۱۹۸۷ ع

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

[illegible]

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ع میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

۱ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام کرنا
۲ تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں میں اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ اردو ودیگر متعلقہ زبانوں کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

نوائے ادب بمبئی

(۱۹۵۰ع)

(ہر سال دو بار اپریل اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

خصوصیات

۱ اردو ومتعلقہ زبانوں و ادبیات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو ودیگر متعلقہ زبانوں سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر نقد وتبصرے

(سالانہ چندہ : ۲۵ روپیے)

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ڈائرکٹر
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ ، دادا بھائی نورو جی روڈ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۳۷ — شمارہ ۱

اپریل ۱۹۸۷ء

•

مندرجات

S1/72

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب ، بمبئی

Registration No. 32009/50 — رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نوعیت اشاعت	:	ششماہی
نام پرنٹر	:	جناب عبدالمجید پالکا ،بی، کام (آنرز)
قومیت	:	ہندوستانی
پتـــہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پبلشر قومیت پتـــہ		ایضاً
نام ایڈیٹر	:	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ
قومیت	:	ہندوستانی
پتـــہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پتہ مالک رسالہ	:	ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید ای پالکا

• • •

All remittances be sent& correspondence be made to
Prof. N. S. Gorekar, MA, PhD, D Litt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

•

Annual Subscription

Inland : Rupees Twenty-five • Foreign : Pound Five

احوال واقعی

جشن صد سالہ

بفضل ایزدی انجمن اسلام جیسے تاریخ ساز تعلیمی ادارے کی صد سالہ تقریبات دسمبر ۱۹۸٦ع کے اواخر میں بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوئیں۔ مسرت کا مقام ہے کہ انجمن نے اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح ایک طرف ھندوستان بلکہ دیگر بیرونی ملکوں میں اسکی پذیرائی ہوئی تو دوسری جانب آئندہ کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے ایک خطیر رقم جمع کرلی۔

صد سالہ تقریبات میں اساتذۂ انجمن اسلام کی خدمات کا اعتراف، نئی تعلیمی پالیسی کے تعلق سے مذاکرہ اور انجمن کے اداروں کی جانب سے تعلیمی نمائش کا اہتمام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ انجمن نے ماضی اور حال کے اساتذہ کی خدمات کا اعتراف شالوں اور توصیفی سندوں سے کیا۔ ماضی کے سربراہ اساتذہ میں خلیفہ ضیاءالدین صاحب شہاب الدین دسنوی صاحب اور تصدق حسین تاجی صاحب اور حال کے سربراہوں میں پروفیسر نظام الدین گوریکر، پرنسپل قادر حسین، پرنسپل عبدالباری، محترمہ رئیسہ سید، محترمہ رشیدہ قاضی اور دوسرے اساتذہ قابل ستائش ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی کے عنوان پر مذاکرہ بڑا کامیاب رہا اس سلسلے میں صدر انجمن ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کے ساتھ ڈاکٹر آدم عثمان شیخ اور جناب عبدالستار زری والا صاحب کی خدمات قابل مبارکباد ہیں۔ ان کی مساعی سے یہ مذاکرہ اعلیٰ پیمانہ پر ہی نہیں منعقد کیا گیا بلکہ خاصا کامیاب رہا۔ تعلیمی نمائش میں انجمن کے تمام اداروں نے اپنی اپنی کاوشوں کو علمی طریقے پر پیش کیا تھا۔ اردو ریسرچ انسٹی کے زیر اہتمام قدیم کتابوں کی نمائش کے ساتھ خطاطی تربیتی مرکز کے طلبہ کے خطاطی کے نمونے بھی پیش کئے گئے جسے جج صاحبان نے بہت پسند فرمایا اور انعام سے نوازا۔

یادگار سیرت تقریر

حسب معمول امسال بھی یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو معین الدین حارث یادگار سیرت تقریر کا اہتمام کریمی لائبریری ہال میں کیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی کے عربی شعبہ کے صدر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے "عالم بشریت کے لئے سیرت طیبہ کی اہمیت" پر بصیرت افروز تقریر کی۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا (صدر انجمن اسلام) نے انجام دیئے اور پروفیسر نظام الدین گوریکر (ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) نے ھدیۂ تشکر پیش کیا۔

کریمی لائبریری کی تنظیم

یہ لائبریری اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اس میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطوں اور کتابوں کے علاوہ اسلامی علوم و فنون پر بھی اچھا ذخیرہ ہے۔ کتابوں کی جلد بندی اور از سرنو تنظیم کے سلسلے میں صدر انجمن ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے جناب عبدالمجید پالکا (جنرل سیکرٹری) اور ڈاکٹر نظام الدین گوریکر (ڈائرکٹر) سے مشورہ کرکے ایک بڑی رقم مختص کردی ہے اور انجام کار تنظیم نو اور جلد بندی کا کام بڑی تیزی سے شروع ہوگیا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے منصوبے

ڈاکٹر جمخانہ والا (صدر انجمن اسلام) نے پروفیسر نظام الدین گوریکر (ڈائرکٹر) اور ڈاکٹر فرید شیخ (ریسرچ افسر) سے ملاقات کے دوران انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً علمی اور ادبی تقاریر کے اہتمام پر زور دیا اور فرمایا کہ آئندہ تعلیمی سال سے مہمان مقررین کے تقاریر کا انسٹی ٹیوٹ خاطر خواہ انتظام کرے۔ اس مد میں ایک رقم مختص کردی ہے۔

جامعہ اردو کے ریفریشر کلاسیں

جامعہ اردو کے امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ نئے تعلیمی سال سے ریفریشر کورس ازسرنو جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مہاراشٹرہ اردو اکادمی نے ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کی صدارت کے زمانے میں مبلغ دس ہزار روپے سالانہ گرانٹ اس کورس کے اجراء کے لئے منظور کی تھی۔ بعد میں نہ معلوم وجوہات کی بنا پر گرانٹ کو جاری نہیں رکھا گیا اور کورس کو بند کرنا پڑا۔

(مدیر)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

انجمن اسلام بمبئی کی صد سالہ
تقریبات کی ایک اجمالی روداد

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انیسویں صدی کا نصف آخر ایک ایسا یادگار زمانہ تھا جب ایک طرف حصول آزادئ ہند کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس جیسی مجاہدین آزادی کی جماعت نے جنم لیا اور صدائے بازگشت کے طور پر مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر اینگلو محمدن اورینٹل کالج کے ذریعے علیگڑھ تحریک کا آغاز ہوا تو دوسری جانب اس تعلیمی تحریک کی بدولت عروس البلاد بمبئی میں انجمن اسلام جیسے ایک تعلیمی اور ثقافتی ادارے کا قیام ۱۸۷۵ع میں عمل میں آیا۔ یہ سچ ہے کہ انجمن اسلام کی مجلس عاملہ اور مجلس عام نے عموماً اور سربراہوں میں جناب عبدالرحمن انتولے صاحب، جناب عبدالقادر حافظکا صاحب اور جناب معین الدین حارث صاحب خصوصاً اپنے دور صدارت میں اپنی بساط کے مطابق صد سالہ جشن منانے کے فیصلے کرتے رہے لیکن ناخوشگوار ماحول اور نامساعد حالات ہمیشہ مانع رہے اور جشن کو ملتوی کرتے رہے حتیٰ کہ ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب نے انجمن اسلام کی صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی نہ صرف انجمن کی صد سالہ تقریبات کے تعلق سے سلسلۂ جنبانی شروع کردی بلکہ سن ۱۹۸۵ع میں مجلس صد سالہ تقریبات کی تشکیل دی اور وی ٹی کامپلیکس بوری بندر بمبئی کے لان پر یکم مئی ۱۹۸۶ع کو جشن صد سالہ تقریبات کا افتتاح محترم عالی جناب راجیو گاندھی وزیر اعظم جمہوریۂ ہند کے ہاتھوں عمل میں آیا۔
اس موقع پر عالیجناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما (گورنر مہاراشٹرہ)، جناب شنکرراؤ چوہان (وزیر اعلیٰ مہاراشٹرہ)، جناب شرد پوار (سابق وزیر اعلیٰ مہاراشٹرہ)، جناب عبدالرحمن انتولے (سابق وزیر اعلیٰ مہاراشٹرہ) اور مرکزی اور ریاستی وزرا کے

ساتھ ساتھ تقریباً تمام بیرونی ملکوں کے قونصل حضرات، یونیورسٹیوں کے عہدیداران، ماہرین تعلیم، دانشور حضرات اور عمائدین شہر بڑی تعداد میں شریک جلسہ تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ قدیم تعلیمی ادارہ کسقدر مقبول ہے جو ہرطرح سیکیولر ہی نہیں بلکہ مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کا نشان بھی ہے۔

اس افتتاح کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا اور بعد میں طلبہ نے انجمن اسلام کا ترانہ پیش کیا جس کو اردو کے ممتاز شاعر سردار جعفری صاحب نے لکھا اور موسیقار اقبال قریشی صاحب نے ڈائرکٹ کیا۔

صدر انجمن اسلام ڈاکٹر حمخانہ والا صاحب نے اس مبارک موقع پر اپنی استقبالیہ تقریر میں ہمارے محبوب وزیر اعظم راجیو گاندھی اور دیگر معزز شرکائے جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا :

انجمن اسلام بمبئی کی تاریخ میں آج دوسرا یادگار دن ہے۔ پچیس سال قبل پنڈت جواہرلال نہرو نے وزیراعظم ھند کی حیثیت سے صابو صدیق پالی ٹیکنک کی سلور جوبلی تقریبات کا افتتاح کیا تھا اور آج حضور والا انجمن اسلام کی صد سالہ تقریبات وزیر اعظم کی حیثیت سے افتتاح فرمانے کی غرض سے تشریف فرما ہیں جو ہمارے لئے باعثِ فخر و مسرت ہے۔ اگرچہ دو سال قبل ہماری محبوب وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے بھی انجمن کے کارپردازان کو بمبئی کے راج بھون میں شرف ملاقات بخشا تھا۔

انجمن اسلام اور انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ایک ہی وقت میں ہوا۔ انجمن اسلام کے بانیوں کے پیش نظر مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور اخلاقی حالت کی بہتری اور بہبودی مقصود تھی۔ اپنے سیاسی مقاصد اور مطالبات کےلئے انہوں نے اپنے ہم مذہب لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس جیسے قومی ادارہ کا ساتھ دیں۔ جسٹس بدرالدین طیب جی نے ۱۸۷۷ع کے کانگریس کے تیسرے اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں پر زور الفاظ میں کہا تھا کہ وہ انجمن اسلام کی نمائندے کی حیثیت سے شریک ہورہے ہیں۔ بالفعل انجمن اسلام نے

اپنی توجہ بالخصوص تعلیمی اداروں کے قیام اور سماجی کاموں کی انجام دہی پر مرکوز کی۔

آج یہ ادارہ انجمن اسلام چوسٹھ (۶۴) چیریٹیز اور فنڈوں کا انتظام کرتا ہے۔ اس کی نگرانی میں پچیس ادارے چل رہے ہیں جن میں انجینیرنگ کالج، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کامرس اور اکنامکس کالج، صابو صدیق پالی ٹیکنک، ویمنس پالی ٹیکنک، طلباء اور طالبات کے جونیر کالجز، ہائی اسکولز، لڑکیوں کے یتیم خانے، سبحانی ہوسٹل، ٹیکنکل اور کامرشیل ہائی اسکولز، پبلک اقامتی اسکول (پنچ گنی)، کریمی لائبریری اور ادبی پرنٹنگ پریس شامل ہیں۔ آج ہر مذہب، قوم اور نسل کے تقریباً ستائیس ہزار طلبہ ان اداروں میں تعلیم پارہے ہیں۔

جناب وزیر اعظم! انجمن اسلام اقلیتی کردار کا ایک نمائندہ ادارہ ہے۔ ایسے اداروں کے چند مسائل ہوتے ہیں۔ «اقلیت» سے میری مراد مسلم مذہبی اقلیت نہیں ہے۔ درحقیقت ہر ریاست کا ایک لسانی اور تہذیبی طبقہ دوسری ریاست میں ایک اقلیت کی شکل میں رہتا ہے۔ دستور ہند کے معماروں نے جب دفعہ تیس کو اس میں شامل کیا تو اس سے ان کا مطلب نہ کسی فرقــہ کو خوش کرنا تھا نہ فراخدلی کا مظاہرہ کرنا تھا بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور دور بینی سے اس مسئلہ پر ایک حقیقت پسندانہ نظر ڈالنا تھا اور کثیر تہذیبی اور مذہبی ہندوستانی سماج میں اقلیتوں کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاو کرنا تھا۔

اقلیتوں کے قائم کردہ ادارے دور افتادہ جزیرے نہیں ہیں بلکہ (مین پاور) شخصی طاقت کے اتنے ہی مظبوط ذرائع اور وسائل ہیں جتنے اکثریتی فرقے کے ہوتے ہیں۔

انجمن اسلام کو اس بات کا یقین ہے کہ ملک و قوم کی صلاح و فلاح کے لئے اقلیتی اداروں پر حکومت کی ذمہ داری یکساں ہے۔ اس کو نہ نظر انداز کیا جاسکتا اور نہ پس پشت ڈالا جاسکتا ہے۔

دستور کی دفعات کی بحالی اور اس کا نفاذ ہر وقت اور ہر طریقہ سے ضروری

ہے اس سلسلے میں آنکم ٹیکس کی ایک دفعہ کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں جس میں عطیات کو مستثنیٰ کرنے کی شرائط دی ہوئی ہیں۔ ان شرائط پر دوسری نظر میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خیرات اور عطیات میں عوام کی شرکت پر یہ کسی نہ کسی طرح مخالفانہ طریقہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

اپنے اقلیتی کردار کے باوجود قومی سالمیت انجمن اسلام کا خاص مقصد رہا ہے۔ اپنے قیام کے زمانے سے آج تک انجمن کے تمام اداروں کے دروازے سماج کے تمام افراد کے لئے کھلے ہیں، چاہے وہ کسی نسل، کسی فرقہ یا کسی مذہب کے ہوں۔ افراد کی یہ بوقلمونی اور طلبہ کی یہ رنگا رنگی جو انجمن اسلام میں نظر آتی ہے دوسرے اداروں میں مشکل سے ملیگی۔

انجمن کے اراکین ملک میں تعلیم کی تشکیل نو کے بارے میں آپ کی خواہشات سے پوری طرح واقف ہیں۔ جو آنے والی صدی کے چیلنج کو قبول کرسکیں آپکی اس شدید دلی خواہش سے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ اپنے قومی ورثہ کی محافظ نئی نسل توانا، متحد اور روشن خیال افراد پر مشتمل ہو۔

ہمیں فخر ہے کہ اس شہر میں سب سے پہلے ہم نے غیر سرکاری ٹیکنیکل اور کامرشیل اسکول، غیر سرکاری پالی ٹیکنک، اور طالبات کیلئے اردو ذریعۂ تعلیم کے غیر سرکاری اسکول قائم کئے۔ اس جشن صدی کے موقع پر دو کڑوڑ روپے کے تعلیمی منصوبے ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں اپنے تعلیمی اداروں کی تشکیل نو میں آپکی تعلیمی پالیسی کے اعلان اور نفاذ کے بعد رہنمائی ملیگی۔

ہم اس موقع پر حکومت مہاراشٹرہ اور خاص طور پر ریاستی تعلیمی محکمہ اور ٹیکنکل ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ، بمبئی میونسپل کارپوریشن، اور بمبئی یونیورسٹی کے کارپردازوں کے تعاون کے لئے شکریہ ادا کرتے ہیں

ہم علم و دانش کے طالب ہیں، ملک کی ترقی اور بہبودی ہمارا عین مقصد ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ قومی یکجہتی کی روحانی اور مادی شکلیں ایک ساتھ پروان چڑھیں گی اور اس صد سالہ جشن کے موقع پر ہم ملک کی شان و شوکت

اور اتحاد و اتفاق کو برقرار رکھنے کا عہد کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی اس استقبالیہ تقریر کے بعد عالیجناب وزیراعظم راجیو گاندھی نے جشن کا افتتاح کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا :

دیش کے کونے کونے سے نئی تعلیمی تجاویز پر گذشتہ دس مہینوں سے طویل بحث و مباحثہ اور اس میں ضروری رد و بدل کرنے کے لئے ایوان کی منظوری کے لئے پارلیمنٹ میں اس بل کو پیش کیا جارہا ہے۔

تعلیم کے قدیم ڈھانچے میں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ناگزیر ہوگئی ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے وزیر اعظم نے اس امید کا اظہار کیا کہ تعلیم کا نیا ڈھانچہ بلا لحاظ مذہب و ملت ، رنگ و نسل اور جنس و ثقافت نہ صرف شہریوں کو یکساں مواقع فراہم کرے گا بلکہ ملک کی اجتماعی ترقی میں بھی انتہائی ممد و معاون ثابت ہوگا۔

وزیر اعظم نے مزید فرمایا کہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کو آج تک نظر انداز کیا جارہا ہے ۔ خاص طور سے اقلیتوں ، ہریجنوں اور ادیواسیوں کے یہاں لڑکیوں کی ناخواندگی کا تناسب بہت زیادہ ہے ۔ ہر فرقہ اور قوم کی خواتین میں تعلیم عام کرنے کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ہمارے سماج میں جنس کی بنیاد پر نظر انداز کی گئی ملک کی آدھی آبادی کی تعلیم و تربیت کا حکومت نے بیڑا اٹھایا ہے ۔ اگر ہماری آدھی آبادی پچھڑی رہ جائے ، انہیں تعلیم نہ ملے تو ملک کی ترقی کو بھی مکمل نہیں کہا جاسکے گا۔ ہماری حکومت نے اچھے اسکول اچھے اساتذہ ، اچھے طلبا و طالبات کے علاوہ تعلیم کی پیاس رکھنے والی بچیوں کے خاندانی حالات ، ان کے والدین کی مشکلات وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے کہا اگر ماں باپ توجہ دینگے تو لڑکیوں کی تعلیم میں اضافہ ہوگا۔

وزیر اعظم نے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ان کی حکومت اس بات کو بھی پیش نظر رکھے گی کہ نئی تعلیمی پالیسی سے مستحق اور باصلاحیت لوگ استفادہ

کر سکیں نہ کہ صرف ماثر اور مخصوص طبقہ کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سیکیولرزم ایک انگریزی لفظ ہے جسے ہم نے مغرب سے مستعار لیا ہے۔ لغت میں اس لفظ کے معنی کچھ اور ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کے معنی "سرو دھرم سمبھاؤ" ہے۔ یعنی ہم مذہب کی بنیاد پر کوئی تخصیص روا نہیں رکھتے۔ ہماری نظر میں سارے مذاہب یکساں ہیں۔ لفظ "سیکیولرزم" ان معنوں میں اس بات کا احاطہ کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ ہمارے آئین سازوں نے جس مقصد کے پیش نظر اس لفظ کا انتخاب کیا تھا اسے ہم آج بھی برت رہے ہیں۔

صحتمند قدروں اور اصولوں پر چلنا، انہیں مظبوط کرنا اور ملک کو ترقی کی راہ پر آگے لے جانا ہے تو ہمیں سب مذہب والوں کو ساتھ لیکر چلنا ہوگا۔ کسی ایک مذہب کو دباکر ایسا نہیں کیا جاسکتا۔

مغربی ذرائع ابلاغ مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کرکے ہماری منفی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں ایک جانب توہم پرستی، روایاتی فکر اور غیر صحتمند دقیانوسیت ہے تو دوسری جانب ہمارا اپنا مذہب ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک واضح خط تفریق ہمیں کھینچنا ہوگا سیاست، سماج اور تعلیم غرض کہ ہر محاذ پر ہمیں ڈٹ کر ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے عناصر کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔

انہوں نے مزید فرمایا کہ توہم پرستی سے نہ کسی مذہب کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ اس سے ملک ترقی کرسکتا ہے۔ اس خطرناک رجحان سے ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو کم از کم اپنی بھلائی کے لئے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

انجمن کے صد سالہ جشن میں شرکت پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا کہ انجمن اسلام نے ایک سو گیارہ (۱۱۱) برسوں میں جو تعمیری کام کئے ہیں وہ یقیناً قابل ستائش ہیں۔

اقلیتی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے مزید کہا کہ ایک دیش میں ایک دھرم

یا ذات کے ماننے والے اقلیت میں ہوتے ہیں تو دوسرے ملک میں وہی اکثریت میں ہوسکتے ہیں مگر دونوں کے مسائل اور مشکلات یکساں ہوتے ہیں۔

انجمن اسلام کے سابق صدر بدرالدین طیب جی کی قومی یک جہتی کے تعلق سے خدمات کو وزیر اعظم نے سراہتے ہوئے اس سو سالہ قومی تعلیمی ادارے کے لئے اپنے تمام تر تعاون کا یقین دلایا۔

قومی یکجہتی پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ سارے بھارت کی ایک تہذیب ہے۔ اروناچل سے گجرات، کشمیر سے تامل ناڈو تک ہر شہری بھارتی یا ہندوستانی ہے لیکن کبھی کبھی وہ اپنی زبان، اپنی قوم یا اپنی تہذیب کی باتیں کرنے لگ جاتا ہے اگرچہ زبان و قوم و تہذیب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

صد سالہ جشن کی افتتاحی تقریب میں عالیجناب شنکرراؤ چوہان، (وزیر اعلی مہاراشٹرہ) نے اپنی مختصر سی تقریر میں صد سالہ جشن پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بھی اقلیت اور اکثریت میں تمیز کرنے والا انسان نہیں ہوں۔

انجمن اسلام کی تعمیری اور فلاحی خدمات کے اعتراف میں انجمن کی دیگر سرگرمیوں کے لئے وزیر اعظم کی موجودگی میں اپنی حکومت کی جانب سے مبلغ ایک لاکھ روپے کے عطیہ کا اعلان کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہوں۔

اس افتتاحی تقریب کے موقع پر «انجمن کی تاریخ» اور «سوینیر» کا اجراء وزیر اعظم کے مبارک ہاتھوں ہوا۔ جناب عبدالمجید پالکا صاحب (اعزازی سیکرٹری انجمن اسلام) نے شکریہ ادا کیا اور قومی ترانہ کے ساتھ یہ افتتاحی جلسہ بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔ اس ضمن میں یہ عرض کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ «انجمن کی تاریخ» میں کچھ باتیں غیر تاریخی اور غیر ضروری درج ہوئی ہیں۔ جنھیں آئندہ ایڈیشن میں ضرور دور کیا جائیگا۔

اس افتتاحی تقریب سے قبل کل ہند انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی دسویں کانفرنس کا انعقاد اپریل ۱۹۸۶ع میں ہوا جو انجمن اسلام کی صد سالہ تقریبات کی ایک کڑی تھی۔

شانِ مکانند ہال ماٹونگا (بمبئی) کے وسیع ہال میں انجمن اسلام کے قابل ستائش سابق طالب علم اور مشہور اداکار جناب یوسف خان عرف دلیپ کمار کی

رہنمائی میں صد سالہ تقریبات کے تعلق سے ایک ثقافتی پروگرام ۲۲ اگست ۱۹۸۶ع کو ترتیب دیا گیا۔ اس پروگرام میں ملک کے ممتاز فنکاروں نے حصہ لیا اور پروگرام کو کامیاب بنایا اور کوئی تیس لاکھ روپے بطور عطیہ جات یا دیگر ذرائع سے وصول پائے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند غیر سماجی عناصر نے اس پروگرام کو ناکام کرنے کی سعی کی تھی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔

اس موقع پر ہمارے صدر ڈاکٹر حمخانہ والا صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

انجمن اسلام (بمبئی) ہمارے ملک کا ایک ممتاز تعلیمی، سماجی و ثقافتی ادارہ ہے۔ اس کا قیام ۱۸۷۵ع میں ہوا۔ اس وقت سے آج تک اس ادارے نے مسلمانوں کی تعلیمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی خدمات بحسن و خوبی انجام دی ہیں۔ اور اسطرح ان میں سیاسی بیداری، سماجی جذبہ اور تعلیمی شعور پیدا کیا ہے اور صالح زندگی اور اعلیٰ قدروں کی تعلیم و ہدایت کی کوشش بھی کی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ حصول آزادی، ترقی و بہبودی، تحفظ و سالمیت میں ہمارے ادارے کی خدمات کسی دوسری قوم یا دوسری سیاسی اور غیرسیاسی جماعت سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ جسٹس بدر الدین طیب جی جیسے روشن خیال اور بیرسٹر اکبر پیر بھائی جیسے دریا دل معماران قوم کا ایک سلسلہ چلا آرہا ہے۔ علم و تہذیب کی جس مشعل کو لیکر ہمارے بزرگ آگے بڑھے تھے اس کی جوت کو روشن کرنا ہمارا فرض عین ہے کیونکہ انجمن ہمارا قومی ورثہ ہے۔

ایک سو گیارہ سال کے طویل عرصے میں انجمن کی کامیابی یا ناکامی، شور یا سکوت اور سود یا زیاں کی داستان ہمارے ان تمام اداروں کی کارگذاریوں میں پوشیدہ اور محفوظ ہے۔

ہماری انجمن کی تحریک کا آغاز انجمن اسلام ہائی اسکول بوری بندر کی شکل میں ہوا۔ آج کئی ادارے ہمارے طالبان علم کو فیض پہنچارہے ہیں۔ ان میں

بلا تفریق مذہب و ملت ، بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا لحاظ فکر و نظر ہر قوم کے نونہالان سیراب ہورہے ہیں اور بالخصوص بیرسٹر عبد الرحمن انتولے ، اداکار یوسف خان (دلیپ کمار) اور ڈاکٹر عبدالرحیم انڈرے جیسے طلبہ کے علم و فضل ، سیاست و تمدن اور صنعت و حرفت میں قابل رشک کامیابی و کامرانی اور نام و نمود حیرت انگیز ہے ۔

یہاں یہ عرض کرنا بےجا نہ ہوگا کہ ان کی شہرت اور کامیابی میں اللہ کے فضل و کرم کے ساتھ ان کا ذوق و شوق اور شفیق والدین کی توجہ اور مہربان اساتذہ کی محنت کا بھی بڑا حصہ ہے ۔

اساتذہ میں خلیفہ ضیاء الدین صاحب ، سید شہاب الدین دسنوی صاحب اور تصدق حسین تاجی صاحب کے علاوہ حال کے اساتذہ بھی لائق تعظیم و تکریم ہیں ۔ ہمارے قابل قدر طلبہ کے دلوں میں اپنے مادر علمی سے بے پناہ محبت ہے اور سچ پوچھئے تو یہ ان ہی کا ادارہ ہے ۔ ان کی پرخلوص سعادت مندی پر ہمیں ناز ہے اور ہم ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔ ان کے جذبے کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے ۔

آج کی اس مجلس میں فلمی صنعت کی شہرت کے مالک انسان دوست اور قوم پرور جناب یوسف خاں عرف دلیپ کمار شہنشاہِ اداکاری ہمارے درمیان موجود ہیں ۔

یہ تہنیتی تقریب ان کی تگ و دو اور کد و کاوش کا نتیجہ ہے اس کو کامیاب بنانے میں انھوں نے بڑی لگن اور محنت سے کام لیا ہے اور اپنا قیمتی وقت دیا ہے ۔ اس تقریب کی کامیابی کا سہرا ان کے سر ہے ۔

دراصل یہ خدمت ان کا فرض تھا ۔ اگرچہ اس دور میں جہاں فرض شناسی عنقا ہے وہاں انجمن سے ان کی شیفتگی قابل تعریف اور لائق تقلید ہے ۔ وہ یقیناً اس صنعت کے « یوسف » اور انجمن کے « عزیز » ہیں ۔

اس تقریب کا مقصد انجمن کے توسیعی پروگراموں کی تکمیل ہے ۔ اور انجنیئرنگ کالج کی توسیع و ترقی ، پنچ گنی میں طالبات کا اسکول ، دارالاقامہ اور پولی ٹیکنک کا قیام ، صحافتی اسکول ، کے ساتھ ساتھ کیریر کورسیز کے تربیتی مراکز

کا اجراء، یتیم خانوں کی نگہداشت اور انکی ترقی کے بہتر ذرائع کی فراہمی کریمی لائبریری کی ترتیب و تجدید کی ترقی، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی توسیع اور اسلامک مرکز کا قیام و ترقی، موجودہ تعلیمی اداروں میں تعمیری اضافے اور عمارتوں کی درستی اور روغن کاری وغیرہ ہمارے منصوبوں میں شامل ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان منصوبوں کے حصول کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ آج کا یہ ثقافتی پروگرام اور دیگر ذرائع سے ہمیں دو کروڑ روپے فراہم کرنا ہے یہ ہمارا نشانہ ہے۔

یہ نیک کام ہے۔ قوم کے نونہالوں کو نیک، صالح اور خود کفیل بنانا ہے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہ کر ملک و قوم کے وقار کو قائم رکھتے ہوئے ایک باعزت زندگی بسر کرسکیں۔

ہماری قوم اور تہذیب کی بقا کا انحصار ہماری آئندہ نسل کی فلاح و بہبودی پر ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ہماری رہنمائی کی ہے اور اسطرح ہماری قوم کی خدمت کی ہے۔ اب ہماری باری ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھانا اور زندہ رکھنا ہے اور اس کی بقا اور تابندگی آپ کی اعانت اور تعاون کے بغیر ناممکن ہے۔

میں انجمن اسلام کے ممبران، اداروں کے سربراہوں، تمام مشتہرین اور فنکاروں میں خصوصاً لتا منگیشکر، کلیان جی آنند جی، عبدالحلیم جعفر خان، روشن کماری شمبھو سین اور ان کے رفقائے کار کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے ہمارا بھرپور تعاون کیا۔ ان کی ہمدردی اور مدد شریک حال نہ ہوتی تو شاید ہماری اس تقریب کی کامیابی ادھوری رہ جاتی۔

۸ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو برلا ہال نزد بمبئی ہاسپٹل ایک تہنیتی جلسہ قابل طالب علم دلیپ کمار اور مقبول اساتذۂ انجمن اسلام کی خدمات کے اعتراف میں منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے انجام دئے اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

یہ روشن حقیقت ہے کہ انجمن اسلام بمبئی نے اس طویل مدت میں مسلمانوں کی

تعلیمی، ادبی، ثقافتی، سیاسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ۔ ان کے تعلیمی احساس ثقافتی شعور اور قومی جذبے کو بیـــدار کیا ہے، اس کی تربیت کی ہے، اس کو نکھارا ہے ۔ صالح کردار اور اخلاقی اقدار کی تعلیم و تبلیغ بھی کی ہے۔

ہمیں بجا طور پر ناز ہے کہ ہمارے اداروں نے ملک کی آزادی کی جد و جہد ترقی و بہبودی، تحفظ و سالمیت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

انجمن ہمارا ایک قومی ورثہ ہے اور بے لوث خدمت ہمارا فرض عین ہے۔ یہ جذبہ ہمیں بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے علم کی جو شمع روشن کی، تہذیب کی جو جوت جگائی، اس کو روشن اور تیز کرنا اور وسیع حلقوں میں پھیلانا اب ہمارا کام ہے۔

انجمن کے فیض یافتہ طلبہ کی فہرست طویل ہے۔ ان میں کئی طالب علموں نے علم و فضل، سیاست و تمدن، صنعت و حرفت میں بڑا نام پیدا کیا ہے، ہمارے طلبہ کی قابل رشک کامیابی، سرفرازی اور سر بلندی ہر شخص سے خراج تحسین حاصل کررہی ہے۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے سابق طلبہ کے دلوں میں اپنے مادر علمی سے بے پناہ محبت ہے ،اور مختلف شکلوں میں وہ اس کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ہمیں ان کی پرخلوص سعادت مندی پر ناز ہے۔ ان میں ایک عالم گیر شہرت کی حامل مثالی شخصیت جناب یوسف خان عرف دلیپ کمار کی ہے۔

دلیپ کمار صاحب کو اپنے مادر علمی انجمن اسلام سے پرخلوص محبت اور والہانہ شیفتگی ہے۔ انجمن کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں انھوں نے ٹھوس خدمات انجام دی ہیں، اپنا قیمتی وقت دیا ہے، انجمن کے مختلف جلسوں میں نہ صرف شرکت کی ہے بلکہ اس کے مقاصد کے حصول اور منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں مفید مشورے دیئے ہیں، راہیں بتلائی ہیں، راستے ہموار کئے ہیں اور بڑی جانفشانی اور سرگرمی سے سرمایے کی فراہمی میں بڑی تگ و دو کی ہے۔ ان کی انتھک کوشش سے ہمارے دو کروڑ روپے کے نشانے کا تقریباً چھٹا حصہ وصول ہوا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انکی مساعی سے اس نشانہ کے نصف تک رسائی ہوجائیگی۔ آج کی یہ تقریب بالخصوص ان ہی کے اعزاز میں منعقد کی گئی ہے۔

اس موقع پر انجمن کے قابل اساتذہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اساتذہ قوم کے معمار ہوتے ہیں، پرخلوص محبت اور بے لوث خدمت کے بغیر کوئی تعلیمی ادارہ سرخرو نہیں ہوسکتا۔ ہمارے اساتذہ نے ملک و قوم کو ایسے ہونہار طلبہ پیداکئے جو ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔ انھوں نے نہ صرف طلبہ کے دماغوں کی صحیح تربیت کی بلکہ اپنے اخلاق و کردار کے ذریعے ان کو صحیح معنوں میں انسان بنایا اور ان میں انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کیا۔

ان بزرگ اساتذہ میں خلیفہ ضیاء الدین صاحب، شہاب الدین دسنوی صاحب اور تصدق حسین ناجی صاحب آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ دیگر اساتذۂ کرام کی خدمات بھی لائق ستائش ہیں جنھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اس ادارے کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ ان کی فرض شناسی، ایثار و قربانی اور بے لوث خدمات نے اس معزز پیشہ کے وقار کو بڑھایا ہے۔ حال کے سربراہ اساتذہ میں پرنسپل قدر حسین، ڈاکٹر نظام الدین گوریکر، محترمہ رئیسہ سید، پرنسپل سید عبدالباری اور محترمہ رشیدہ قاضی قابل ذکر ہیں۔

انجمن انکی کماحقہ خدمت نہیں کرسکتی۔ دراصل ان کی خدمات کا کوئی معاوضہ بھی نہیں ہوسکتا تاہم اس جشن صد سالہ کے موقع پر ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کی خدمت میں شال اور توصیفی سند پیش کی جارہی ہے۔ ہمیں قوی امید ہے وہ ہمارے اس حقیر تحفہ کو قبول فرمائینگے۔

اس تقریب کا خاص حصہ ادبی نشست یعنی مشاعرہ ہے۔ اس میں ملک کے ممتاز شعراء شرکت کر رہے ہیں، جن میں علی سردار جعفری صاحب، مجروح سلطان پوری صاحب، کیفی اعظمی صاحب، عزیز قیسی صاحب، فضیل جعفری صاحب حسن کمال صاحب، انجم رومانی صاحب، قیصر الجعفری صاحب، ظفر گورکھپوری صاحب کے علاوہ مہمان شاعر راحت اندوری صاحب تشریف فرما ہیں۔ میں ان تمام شعرا حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

سہ روزہ تعلیمی مذاکرات کا انعقاد یکم نومبر ۱۹۸۶ع کو انجمن اسلام کامپلکس

میں ہوا۔ جامعہ ملیہ دہلی کے چانسلر جناب خورشید عالم خان صاحب نے افتتاح کیا اور ڈاکٹر مدھوری شاہ صاحبہ سابق صدر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دہلی نے صدارت فرمائی اور آرم بشپ سائمن پی مینٹا نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے شرکائے مذاکرہ اور مندوبین حضرات کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا:

انجمن اسلام بمبئی کے جشن صدی سالہ تقریبات کے تعلیمی سیمنار کے افتتاحیہ جلسے میں آپ حضرات کا خیر مقدم کرتے ہوئے فخر و مسرت محسوس کررہا ہوں۔

اِس حقیقت کے بیان کی تکرار کی معذرت چاہتا ہوں۔ انجمن اسلام بمبئی کی جڑیں بمبئی کے علاوہ پونا اور پنچ گنی میں پھیل گئی ہیں ایک سو گیارہ سال کی مدّت میں اس کے زیر سایہ ستائیس تعلیمی اور سماجی ادارے چل رہے ہیں اور ہندوستانی سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں کی بروقت قابل ذکر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

لارڈ ہاریس کے ہاتھوں سو سال قبل انجمن اسلام ہائی اسکول بوری بندر بمبئی کا افتتاح ہوا اور آج اس کی صدی تقریبات کے درمیانی عرصہ میں حیرت خیز تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ آج سے سو سال پہلے حکومت بمبئی کے سالانہ مبلغ پانچ سو روپیے گرانٹ سے ہائی اسکول کی ابتدا ہوئی اور یہ فخر کی بات ہے کہ اب انجمن اسلام کے اداروں کا سالانہ بجٹ چار کروڑ روپیہ ہے۔

انجمن اسلام کے بانیوں میں جسٹس بدرالدین طیب جی صاحب، ناخدا محمد علی روگھے صاحب، قاسم علی جیراج بھائی صاحب، حاجی صابو صدیق صاحب اور دیگر ہمدردوں کو ہم احسان مندی کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اپنے صدور میں سیف طیب جی صاحب اکبر پیر بھائی صاحب اور معین الدین حارث صاحب کو بھی نہیں بھول سکتے سیف طیب جی کا خاندان، الاطیفی خاندان اور حسین بھائی لالجی اور ان کے افراد ہمارے یتیم خانوں کے سرپرست ہیں، باؤلا اور موسیٰ محمد خاندانوں کے افراد اور حضرات

کے بھی سپاس گزار ہیں جنہوں نے مختلف اداروں کے قیام اور تحفظ و بقا میں زبردست حصّہ لیا ہے۔

تعلیمی سیمنار کی افتتاحی تقریب کی جانب آپکی توجّہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس مذاکرات میں ممتاز مہمانان خصوصی اور معزز مندوبین حضرات اپنے زریں خیالات سے ہمیں مستفیض فرمائیں گے۔

ہمارے مختلف تعلیمی اداروں کے کئی قسم کے توسیعی منصوبے ہیں اس سلسلے میں ہم اپنے طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کو بہتر سے بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ علم کے بے پناہ اور سماجی تقاضوں کے پیش نظر ہم تعلیمی، سماجی اور ثقافتی اعتبار سے کمزور طبقوں کی بہبودی اور ترقی کے لئے علوم و فنون کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کے انکشافات کی قوّتوں سے کام لینا چاہتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی طرف سفر کرنا ہمارا مین مقصد ہے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے انجمن اسلام نے اصلاحی اقدام کے طور پر انجمن اسلام ہائی اسکول قائم کیا۔ اس کے بعد انجمن اسلام کا ہر قدم آگے کی طرف ہی بڑھا اور آج اس کے سائے میں تمام علوم و فنون کے شعبے قائم ہیں۔

ہندوستان کے اقلیتی اداروں میں اہم اور بڑا ہونے کے باوجود انجمن اسلام نے اپنا سیکولر کردار برقرار رکھا ہے اور اسے اپنے سیکولر نظریات پر فخر ہے۔ اس عظیم ادارہ کو چلانے میں یہ دقّت پیش آتی ہے کہ حکومت اور یونیورسٹی دونوں اس کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اگرچہ دستور کے دفعہ ۳۰ (الف) کے تحت ضمانت دی گئی ہے۔

انجمن اسلام اپنے ہردلعزیز وزیراعظم راجیو گاندھی کی نئی تعلیمی پالیسی کی حمایت کرتی ہے اور اس کو کامیاب بنانے کا پورا یقین دلاتی ہے۔ سیمنار دو حقیقت صاف ستھرے اور آزادانہ ماحول میں، ہمارے اداروں میں قومی مسائل پر بحث کا آغاز ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہم اپنے عملی منصوبوں کے وسیلوں اور ان کی تکمیل کے ذریعوں سے زمانے کے چیلنج کا مقابلہ کرسکیں گے۔ ہندوستان کے طول و عرض

سے ممتاز ماہرین تعلیم کو ہم نے اپنی آگہی اور علم کیلئے اظہار خیال کی دعوت دی ہے۔ چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر بعض صاحبان نے عدم شرکت کی معذوری پیش کی ہے مگر سیمنار کی کامیابی کیلئے اپنی نیک خواہشات اور حوصلہ افزا پیغامات بھیجے ہیں۔

بہر حال جو ارباب فکر و نظر اس سیمنار میں شرکت کررہے ہیں وہ تعلیمی فلاح، سماجی بہبودی اور اقتصادی ترقی کے مسائل سے متعلق نہ صرف انصاف کرینگے بلکہ انکا حل بھی تلاش کرینگے۔

شرکائے مذاکرے میں مندوبین حضرات جو دور دراز کے سفر کی زحمت برداشت کرکے تشریف لائے ہیں ہم انکے سراپا سپاس ہیں۔ جو انتظامات ہم نے کئے ہیں وہ اگرچہ انکی شایان شان نہیں ہیں تاہم اُمید ہے کہ وہ ہماری کوتاہیوں اور خامیوں کو درگزر کرینگے۔

اِس سیمنار کو ہم اس سلسلہ کی کڑی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں جو کیرالا سے کشمیر اور بمبئی سے بہار تک ایک مشترکہ سعی کے طور پر شروع ہوگا۔

میں انجمن کے جانب سے اور اپنی جانب سے آپکا تہ دل سے استقبال کرتا ہوں اور دل کی زبان سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

استقبالیہ تقریر کے بعد ڈاکٹر خورشید عالم خان (چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) نے افتتاح کرتے ہوئے فرمایا :

مرکزی حکومت کی نو تعلیمی پالیسی میں بھی اقلیتوں کے تعلیمی مسائل کا خیال نہیں رکھا گیا ہے آج اس بات کی خاص ضرورت ہے کہ خاص منصوبہ جات بنائے اور زیر عمل لائے جائیں۔ جن سے اقلیتوں کا حوصلہ بڑھے اور وہ تعلیم کے میدان میں ثقافتی لحاظ سے جو رکاوٹیں درپیش ہیں انہیں دور کرسکیں اور آگے قدم بڑھا سکیں۔

ڈاکٹر خورشید عالم خان صاحب نے آج یہاں اس امر کی ضرورت جتائی کہ مندرج جاتیوں اور مندرج قبائل کے لئے موجودہ اسکیمات کے انداز پر اقلیتوں کی تعلیم کے لئے بھی ایک "خصوصی منصوبہ عمل" وضع کیا جائے۔

ڈاکٹر مادھوری شاہ صاحبہ (سابق چیرمین، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن) نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ (ایم پی ا جنرل سیکریٹری انڈین نیشنل کانگریس (آئی) نے آج یہاں خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق دینے اور ان کی صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت جتائی۔

ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ صاحبہ انجمن اسلام جشن صد سالہ کمیٹی کے زیر اہتمام عورتوں اور بچوں کی تعلیم اور فلاح و بہبود کے موضوع پر منعقدہ سیمنار کے ایک شعبہ کی صدارت فرمارہی تھیں

موصوفہ نے انجمن اسلام کو جشن صد سالہ اور تعلیم کے موضوع پر سیمنار کے انعقاد پر مبارک باد دیتے ہوئے یقین دلایا کہ انجمن کے تعلیمی مقاصد اور منصوبوں کو آگے بڑھانے اور کامیاب بنانے کیلئے مرکز میں ہم سے جو کچھ ہوسکے گا وہ کریں گے۔

نئی تعلیمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے موصوفہ نے فرمایا کہ اس کے تحت عورتوں کو زیادہ سے زیادہ مواقع دئیے گئے ہیں۔ "پلان آف ایکشن" وضع کیا گیا ہے۔ عورتیں اگر پڑھیں گی، لکھیں گی، ہنر سیکھیں گی اپنے پاؤں پر کھڑی ہونگی اور روزی کماسکیں گی تو اس سے ان کا ہی خاندان بلند مقام حاصل کریگا اور سماج بھی صحیح معنوں میں ترقی کریگا اور خوش حال ہوگا۔ آپ نے مزید کہا کہ کمپیوٹر نظام کے رواج سے روزگار کی نئی راہیں کھلیں گی اس میں عورتوں کو زیادہ موقع دینا چاہئیے۔

ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہاکہ اندرا جی نے سیاسی رہنما اور وزیر اعظم کی حیثیت سے بے مثال خدمت انجام دیں اور عورتوں کا مقام بلند کیا۔ ان کی تقریر کے دوران اقلیت کی

صدا بلند ہوئی جس پر موصوفہ نے تقریر روک دی۔ یہ ان کے دینی جذبہ اور احترام کا ثبوت تھا۔ اذان ختم ہونے کے بعد آپ نے کہا اذان میں حی الفلاح حی الفلاح کی آواز دی گئی جو اس موقع کے لحاظ سے اچھا شگون ہے۔

سیمینار کی آخری نشست میں اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر جمخانہ والا (صدر انجمن اسلام) نے فرمایا :

ہمارے تعلیمی سیمینار کی یہ آخری نشست ہے۔ یہ سمینار جشن صدی تقریبات کا ایک اہم حصہ ہے۔ یکم مئی ۱۹۸۶ء کو ہمارے مقبول رہنما وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جشن صد سالہ کا افتتاح کیا اور انجمن کی صد سالہ تعلیمی، سماجی، سیاسی خدمات کی تعریف کی اور انجمن کے سیکولر کردار کو سراہا۔ اس کے پہلے اور بعد اس سلسلے میں کئی جلسے ہوئے۔ ۲۲ اگست ۸۶ء کو انجمن کے مایۂ ناز طالب علم یوسف خان عرف دلیپ کمار نے ایک شاندار کلچرل پروگرام ترتیب دیا، ۸ اکتوبر ۸۶ء کے جلسہ میں انجمن اسلام نے اپنے سابق اور موجودہ اساتذۂ کرام کو ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر توصیفی اسناد اور شالیں پیش کیں۔ کسی ادارہ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اجتماعی طور پر اساتذہ کی اس طرح پذیرائی کی گئی ہو، انفرادی طور پر یہ کام ہوتا رہتا ہے۔

ہمارے اس سہ روزہ سیمنار میں ملک کے مقتدر ماہرین تعلیم نے شرکت کی اور زریں خیالات سے مستفید کیا۔ ان افکار کی روشنی میں ہم آئندہ اقدامات کریں گے۔ نئی تعلیمی پالیسی ہمارے سامنے ہے۔ اسے کامیاب بنانے کی ہم ہرممکن سعی کرینگے۔

یہ تلخ حقیقت ہے کہ مسلمان، من حیث القوم، تعلیم میں اور بالخصوص جدید تعلیم میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ یوں کہئیے کہ جدید تعلیم کے حصول میں آج بھی وہی کیفیت ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد تھی۔

یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے، مقابلہ اور اختصاص کا زمانہ ہے۔

کنیکی اور سائنسی انکشافات اور سماجی انقلابات سے ہماری عدم آگہی بڑا سخت لمیہ ہے۔ آج علم و ہنر، صنعت و حرفت میں اختصاص حاصل کرنا ضروری ہے یہ اسی وقت ممکن ہے کہ پہلے علم کے مبادیات سے کماحقہ بہرہ مند ہوں۔ ابتدا سے آخری منزل تک عزم و احتیاط کے ساتھ صدق و خلوص سے علم حاصل کیا جائے۔ درس و تدریس کی خدمات انجام دی جائیں۔ اگر ہمارے معماروں نے کہیں اینٹ ٹیڑھی رکھدی تو آخر تک یہ دیوار کج رہیگی۔

انجمن اسلام کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ صدیوں کے طاری جمود نے ہماری قوم کو کس مقام پر لا کھڑا کردیا ہے۔ حالیہ انقلابات، ذہنی تعصبات کی تند موجوں، لسانی تنگ نظریوں اور تاریخی حقایق کی غلط پیش‌کشی نے ہماری قوم کے سامنے کونسی دیواریں کھینچ دی ہیں؟ مسلمانوں کے مسائل کیا ہیں؟ وسائل کی کیا کمی اور کیوں ہے؟ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے، اس صورت حال کو بہتر بنانے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر ہم نے چند منصوبے بنائے ہیں۔ یہ منصوبے زمانے کی سمت اور رفتار اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دئے گئے ہیں۔ ہم اپنے تہذیبی اور مذہبی ورثے کی بقاء و تحفظ کے خواہاں ہیں۔ قوم کے افراد کو مناسب تعلیم کے ذریعے صالح، نیک اور خود کفیل بنانا چاہتے ہیں۔ انجنیئرنگ کالج، میڈیکل کالج، اسلامک ریسرچ سینٹر، کمپیوٹر کورسیز کا مرکز، بزنس مینجمینٹ کا انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انجمن اسلام کے بانیوں اور بزرگوں کے سامنے یہی اعلی اور ارفع مقاصد تھے۔ ان مقاصد کو آگے بڑھانے اور خوب سے خوب تر بنانے کا عزم لئے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔

ان مقاصد کے حصول میں اور انکی تکمیل میں آپکی دعاؤں کے ہی نہیں بلکہ آپ کے مالی تعاون کے طلبگار ہیں۔

ڈاکٹر یوسف نجم الدین (ریکٹر، جامعۃ السیفیہ، سورت) نے سیمینار میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

انجمن اسلام کی یہ تقریبات جو ایک صدی پر گیارہ سال گزرنے کے ساتھ

عالیشان پیمانے پر منائی گی ہیں۔ یہ گویا نشاندہی ہے اس حقیقت کی کہ انجمن کی تعلیمی تحریک اور اس کی تنظیمی سرگرمیاں انشاء اللہ العظیم اور بھی آگے جانے والی ہیں۔

ہماری تمنا اور دعا ہے کہ اس انجمن کے تعلیمی اور تکنیکی اداروں سے تربیت یافتہ نسل پہلے سے کامیاب تر ثابت ہو۔ اسے اپنے اگلوں سے آگے قدم اٹھانے کی توفیق عطا ہو۔

انجمن کی یہ صد سالہ تقریبات ہمارے لئے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے موجودہ داعی مطلق سیدنا محمد برہان الدین صاحب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جہاں بھی تشریف فرما ہوئے انہیں انجمن کی تعلیمی خدمات اور ان تقریبات کا برابر خیال رہا۔ وہ اس ادارے کو معنوی حیثیت سے بھی کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

معنوی حیثیت سے ہماری مراد کیا ہے ؟

یہ درست ہے کہ یہ اسکول جو پانچ سو روپیے سالانہ گرانٹ سے شروع ہوا تھا، آج ستائیس اداروں میں اور کروڑوں روپیے کے بجٹ میں پھیل چکا ہے۔ یہ اس کی ظاہری شان ہے۔ ہر سال یہاں سے کئی سو طلبہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ یہ اس کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اسے مخلص اور دیانتدار کارکنوں کی انتظامی قابلیت نصیب ہے یہ اسکی خوش نصیبی ہے۔

لیکن اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ (اسلام) کے نعرے اور اور پرچم کے سائے میں جو انجمنی تحریک چل رہی ہے اس پر اسلامی اسپرٹ بھی ظاہر ہو۔ تعلیمی نظام تو وہی سب کے لئے ہے جو انگریزوں کے زمانے سے آج تک سو برس میں بہت کم بدلا ہے تعلیمی اداروں کی ساخت بھی قریب قریب وہی ہے۔

لیکن ہمارے پاس اسلام اور اسلامیان ہند کے پاس اور ایک خزانہ بھی ہے، قرآن و حدیث کی روشنی سے منور خزانہ۔ تعلیم کا قرآنی تصور ایک رہنما

اصول یا گائڈ لائن ہے۔ ادھر سے ہمیں غافل نہ ہونا چاہیئے۔

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے اثر سے اور اسی کے ساتھ ملک میں جابجا مسلمانوں کی تعلیمی انجمنیں قائم ہوئیں۔ لاہور، لکھنو، کلکتہ اور مدراس میں انہوں نے اسکولوں اور کالجوں کا جال پھیلایا اور مغربی تعلیم کی طرف نونہالوں کی توجہ دلائی۔ ایک فضا قائم کی جس میں تعلیمی سرگرمیاں پھیلانا آسان ہوگیا۔

بمبئی کی انجمن اسلام بھی ان پانچوں میں سے ایک ہے اور ہمیشہ حرکت میں رہی ہے۔ آج وہ پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہے' یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، تاہم بدلے ہوئے حالات میں اس انجمن کے کارکنوں اور ذمہ داروں پر لازم ہوگیا ہے کہ وہ اپنے ماضی کے ورثے کو تازہ رکھے اور اسے تعلیمی تحریک کا لازمی جزو بنانے پر متوجہ رہیں۔

ہمیں اس رنگا رنگ تہذیبی منظر میں اپنی شناخت سنبھال کر رکھنی ہے تو یہ شناخت اپنے تعلیمی و تدریسی کاموں میں باقی رکھنی ہوگی۔ کوئی نہ کوئی خوبی کوئی نہ کوئی فضیلت انجمن اسلام کے اداروں میں ہونی چاہیئے جس سے وہ پہچانے جائے اور خود انجمن کے کام آئیں۔

علی گڑھ اور بمبئی کے درمیان جغرافیائی فاصلہ تو تھا ہی۔ سیاسی مسلک کا بھی فاصلہ تھا بلکہ یوں کہیئے کہ بعد المشرقین تھا۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کانگریس تحریک کے خلاف تھی۔ وہ مسلمانان ھند کو کسی بھی پولیٹیکل ایجی ٹیشن سے دور رکھنا چاہتے تھے جبکہ بمبئی میں انجمن اسلام کے بانی اور اسکے سرگرم رہنما کانگریسی تحریک کے حامی تھے۔ وہ اس ایجی ٹیشن کے حق میں تھے، تاہم چونکہ نیت نیک تھی، مقصد میں شریک تھے، تعلیمی تلاش اور سرگرمی کی سمت ایک تھی لہذا ان کا پولیٹکل اختلاف حائل نہ ہوا۔

وہی کالج پھیل کر یونیورسٹی بنا اور یہاں ایک اسکول سے ہوتے ہوتے ستائیس ادارے وجود میں آگئے جن میں انجینئرنگ، کامرس، آرٹس اور سائنس کے کالج کے علاوہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شامل ہیں۔

اسلام ایک نظام فکر ہے اور طریق حیات ہے۔ اسلام اول سے آخر دن تک انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

یہ ایک دائرہ ہے جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے نقطوں پر محیط ہے۔ اور اگر ہم اسے صدق دل سے قبول کرلیں تو وطن کی محبت اور تعلیمی اداروں کی خدمت بھی اسی دین کا ایک پہلو ہوجاتی ہے۔

تعلیم ان تمام مواہب کے بھرپور استعمال کا موقع فراہم کرتی ہے جو قدرت کی طرف سے انسان کو عطا ہوئی ہیں اور تعلیم کے نقائص یا تعلیم سے محرومی ایک طرح کا کفران نعمت ہے۔

اسلامی تعبیر میں طلب العلم کو فریضہ کہکر حکم دیا گیا کہ حواس خمسة سے اس کوشش کو کام میں لایا جائے اور خواس خمسہ دو سطحوں پر ہیں۔ حواس ظاہری اور حواس باطنی، ان دونوں سطحوں پر تمام احساسات سے کام لیکر ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ ارض و سما کے درمیان خدا وند عالم کی آیات اور دلائلات پر غور کرسکے۔ اسی کی بدولت سائنسی ترقیوں کی راہ کھلتی ہے، خدا کی ان بشارتوں اور نعمتوں پر غور و فکر؛ کی بدولت وہ روحانی کیفیت حاصل ہوتی ہے جسے خشیۃ اللہ فرمایا ہے۔

«انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء» یعنی بندگان خدا میں اہل علم ہی وہ لوگ ہیں جو خشیۃ اللہ یا خوف خدا رکھتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون سا علم ہے جو «خوف خدا» پیدا کرتا ہے۔ اس کا جواب صاحب الرسائل (اخوان الصفاء) نے عطا فرمایا ہے:

«کلّ ادبٍ لا یُؤدی صاحبه الی طلب الاخرة ولا یعینه علی الوصل الیها فهو وبال علی صاحبه وحجة علیه یوم القیامة» یعنی وہ علم و ادب جو «آخرت» کی طرف اہل علم کی رہنمائی نہ کرے وہ اس شخص کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔

اس نقطے پر نظر رکھتے ہوئے ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کو اس کے انجام یا آخرت سے باخبر رکھنے والا علم ہی ایک نعمت ہے اور وہ دینی بھی

ہے اور دنیاوی بھی. اس عقیدے کی صلابت اور وطن کی محبت لازم ہے۔

یہیں ایک حسن اتفاق کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ اجتماع ماہ ربیع الاول میں ہورہا ہے۔ اس مبارک مہینے میں فخر کائنات سرور کونین کی ولادت ہوئی۔ جس پر سیدنا المقدس طاہر سیف الدین صاحب نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے میں فرمایا ہے:

اـــولاہ لما　　　خلقت ذی السمـٰا
والارض ومـا　　　کان بینـهـمـــا
هـکـذ العلمـا　　　قدرو واف الخـــبر

جس ہستی کی خاطر ارض و سما اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب خلق ہوا تو پھر ان کی امت پر لازم آیا کہ وہ ارض و سما اور اس کے درمیان یعنی عالم موجودات کی ہر شئے کا علم حاصل کرے تاکہ یہ اپنے آقا کے سامنے کل شرمندہ نہ ہو اور اسلام کا سر علمی دنیا میں جھکنے نہ پائے۔

آج اس تاریخی اور علمی سیمینار میں جہاں ملک کے گوشے گوشے سے اہل علم جمع ہیں، جو فیصلے آپ کریں وہ فیصلے وطن عزیز کے موجودہ حالات اور مسلمانان ہند کی ان میں شرکت. دونوں لحاظ سے کامیاب ثابت ہوں۔

ڈاکٹر یوسف نجم الدین کی تقریر کے بعد جناب امین کھنڈوانی صاحب (صدر، حج کمیٹی بمبئی) نے واکولہ کے مضافات میں ایک بیش قیمت قطعۂ اراضی انجمن اسلام کو ہدیہ کیا اور عالیجناب سیدنا محمد برہان الدین صاحب کی جانب سے دس لاکھ روپے کے عطیہ کا اعلان کیا گیا۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سہ روزہ سیمنار کی آخری نشست کی صدارت کرتے ہوئے سیمینار میں شرکت پر مسرت کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ انجمن مستقبل میں اپنا جامع پروگرام ترتیب دے گی۔

سہ روزہ مذاکرات میں جناب سید حامـــد (سابق وائس چانسلر، علی گڑھ

یونیورسٹی)، ڈاکٹر شیخ علی (وائس چانسلر گووا یونیورسٹی)، شری ٹی کے ٹوپے (سابق وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی)، محترمہ مہرو بنگالی (وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی)، ڈاکٹر صفی اللہ (وائس چانسلر کالی کٹ یونیورسٹی)، جناب غلام غوث (چیرمن بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک) اور ڈاکٹر اے یو شیخ (صدر شاد آدم ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ بھیونڈی) کے علاوہ انجمن کے اداروں کے سربراہوں میں سے پروفیسر این ایس گورپکر، پروفیسر اے اے قاضی، پرنسپل ایس اے باری، پرنسپل قادر حسین، محترمہ رشیدہ قاضی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انجمن اسلام کی صد سالہ تقریبات کا اختتام ۱۷ دسمبر ۱۹۸۶ع کو بخیروخوبی انجام پایا۔ انجمن کے اداروں کی جانب سے تعلیمی نمائش کا افتتاح بمبئی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر جی این ابھینکر کے ہاتھوں ہوا۔ آپ نے افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:

۱۱۱ برس قدیم ادارے نے تعلیمی میدان میں گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ انجمن کے صدر ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انجمن کے زیر اہتمام کالجوں کو اقلیتی ادارے کا درجہ دئیے جانے کا معاملہ یونیورسٹی کے زیر غور ہے چونکہ معاملہ دوسری اقلیتی اداروں کا بھی ہے اس لئے اس پر غور و خوض میں کافی وقت لگا ہے تاہم اس سلسلہ میں جلد فیصلہ ہونے کی توقع ہے۔

پروفیسر ابھینکر نے کہا کہ انجمن کے بانی بدرالدین طیب جی بلاشبہ اس ملک کی عظیم ہستی تھیں۔ انہوں نے اور ان کے بعد کے لوگوں نے انجمن کو فروغ دیا اور آج یہ ادارہ ایک چھوٹی سی یونیورسٹی کہا جاسکتا ہے۔

پروفیسر ابھینکر اور دیگر مہمانوں کا خیر مقدم نمائش کمیٹی کے چیرمین محترمہ زلیخا مرچنٹ نے کیا۔

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے اپنی تقریر میں کہا کہ انجمن اسلام کے صد سالہ جشن کی تقریبات اس جلسے سے شروع ہوئی جس کو وزیر اعظم راجیوگاندھی

نے خطاب کیا تھا اور اس جشن کے سلسلہ کی آخری تقریب یہ نمائش جس میں انجمن کے اقلیتی اداروں کے طلبہ اور اساتذہ نے جی جان سے حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج انجمن کے سائے میں ستائیس (۲۷) ہزار طلبہ تعلیم حاصل کررہے ہیں اور آئندہ کے اس پروگرام میں اردو طلبہ کو تربیت وغیرہ فراہم کرنا ہے۔ ڈاکٹر جمحانہ والا صاحب نے کہا کہ مسلم اقلیت کے زیر اہتمام انجمن کا ادارہ سیکولرزم کی ایک روشن مثال ہے اور اس کے تعلیمی اداروں سے تقریباً تمام فرقے کے لوگ فیض اٹھاتے ہیں۔ ہم نے اپنے کالجوں کیلئے اقلیتی درجے دئیے جانے کا بمبئی یونیورسٹی سے مطالبہ کیا ہے۔ انجمن کا سالانہ بجٹ چار کروڑ روپیے تک پہنچ گیا ہے۔

انجمن اسلام کے جنرل سکریٹری عبدالمجید پالکا صاحب نے مہمان خصوصی پروفیسر اوپیکر اور دیگر مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام مفید نایاب کتابوں کی نمائش کی تیاری اور اسکے آئٹم تیار کرنے میں طلبا اور طالبات نے جو عرق ریزی کی ہے وہ اسکا سرسری جائزہ لینے ہی سے آتی ہے۔ اور یہ ان کے فن و ہنر کی عمدہ مثال کہا جاسکتا ہے۔

انجمن اسلام نے علمی اداروں کی جانب سے تعلیمی نمائش کے معائنے کے بعد ججوں کے پینل نے پہلے انعام کیلئے انجمن اسلام کے کرلا ہوائر ہائی اسکول کو منتخب کیا ہے۔ دوسرا انعام انجمن اسلام گرلز جونیئر کالج باندرہ کو، تیسرا انعام پرائمری گرلز کالج پرائمری ماہم کو اور چوتھا انعام انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کتابت مرکز کو دیا گیا۔

انجمن اسلام بمبئی کی صد سالہ تقریبات کا آغاز ۱۹۸۶ع میں اپریل کے وسط میں ہوا اور دسمبر کے اواخر میں بحسن و خوبی اختتام ہوا۔ اس ضمن میں یہاں یہ عرض کردینا مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جشن کی کامیابی کا سہرا انجمن اسلام کے جواں سال و جواں ہمت صدر اور فعال اراکین و علم دوست احباب کے سر ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی
دہلی (٦)

رسالۂ صاحبیہ

(۲)

اس ضعیفہ کا ذکر احوال

میں نے حضرت مرشد، والا جاہ ولایت پناہ برگزیدۂ الٰہ، دلیل راہ ہدا حضرت ملا شاہ کے حالات کو (جو سعادتوں اور نیکیوں سے بھرے ہوئے ہیں) مختصراً بیان کردیا ہے۔

اب مجھ ضعیفہ کی یہ خواہش ہے کہ اپنے بھی کچھ حالات لکھوں اور اس میں اپنے مرید ہونے، دنیاوی خواہشات اور ترغیبات سے اجتناب برتنے، حضرت سے ارادت و اعتقاد پیدا کرنے سے لیکر اس رسالہ کی تحریر تک جو وقوعات پیش آئے ہیں اُنکو بیان کروں۔ اگرچہ یہ بات آئین ادب سے دور ہے کہ جہاں میں حضرت والا کے حالات قلمبند کروں وہیں اپنے احوال کو بھی زبان قلم پر لاؤں لیکن چونکہ حضرت کے مریدوں کے حالات بھی تحریر میں آئے ہیں اس لیے میں اسے وجہ سعادت اور اپنے لیے باعث برکت خیال کرتی ہوں کہ ان سطور میں میرا بھی کچھ ذکر آجائے

معلوم ہو، کہ اس ضعیفہ کی عمر بیس سال تھی جب سے وہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں سچی ارادت اور پکی عقیدت رکھتی ہے۔ اور حضرت خواجگان چشت (قدس اسرار) بالخصوص پیر دستگیر، قطب الاولیا، سید الاتقیا، قدوۃ العارفین، زبدۃ الواصلین، شیخ المحققین، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت کا روشن حلقہ

اس فقیرہ نے اپنے گوش جاں میں پہن رکھا ہے اب سے چند سال پہلے کی بات ہے جب یہ ضعیفہ حضرت کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لیے اجمیر شریف حاضر ہوئی تھی اس کے بعد سے حضرت معین الحق والدین کے ساتھ بندگی و اخلاص کا رشتہ دن بہ دن زیادہ مضبوط ہوتا گیا اور آپ سے دلی وابستگی بڑھتی رہی۔ اللہ جلّ شانہ نے محض اپنے لطف و کرم سے اس فقیرۂ بے بضاعت کے دل میں راہ حق کے لیے طلب اور ذوق و جستجو کی یہ حالت پیدا کی یہانتک کہ سنہ ایک ہزار و چہل نہم ہجری میں، اپنے والد بزرگ گوار، اعلیٰ حضرت ظل سبحانی، صاحب قران ثانی کے ساتھ (اللہ پاک ان کے ملک و سلطنت کو ہمیشہ باقی رکھے) میں ممالک محروسۂ پنجاب (لاہور) آئی اللہ پاک نے حضرت ظل سبحانی کو طاعت و حق شناسی و دین پناہی کی توفیق اپنے بزرگوں سے زیادہ بخشی ہے کہ آپ کے والد (جہانگیر) اور آپ کے دادا (اکبر) اس سعادت سے محروم رہے۔ حضـــرت جہاں پناہ کو اس طرح توفیق ایزدی نے خدمت اسلام اور ترویج دین محمدی کے مقدس کام کی انجام دہی کے لیے انتخاب فرمایا (یہ اللہ پاک کی بڑی عنایات اور بخشایشوں میں سے ہے)

مجھے اپنے بھائی شہزادہ محمد داراشکوہ سے بے حد محبت تعلق خاطر اور اخلاص دلی ہے جو ظل الٰہی کے فرزند ارجمند، سلطنت کے بڑے بیٹے، مملکت ہندوستان کے ولی عہد اور دولت ظاہر و باطن کے وارث ہیں حق پژدہ و بے اندوہ اور صاحب برکت و سعادت ہیں سلسلۂ قادریہ سے مسلک ہیں۔ اللہ پاک اُن کے جلال و شکوہ کو سلامت رکھے اور اُنکی امیدوں کو بر لائے۔ (آمین)

مجھے اپنے اس برادر ولا نژاد سے کمال یگانگت، صوری و معنوی یکجہتی دینی اور دنیـــوی اتحـاد کی دولت حـاصل ہے جو میرے لیے موجب طمانیت و مسرت ہے اور شروع ہی سے ان کے اور میرے مـابین، یہ صورت رہی ہے۔ ہم دونوں دراصل ایک روح ہیں جس کو دو الگ الگ قـالبوں پھونکا گیـا ہے اور ایک جان ہیں۔ جنہیں دو جدا جُدا دو جسموں میں رکھا گیا ہے۔

کہ میرے یہ بھائی عارف کامل ہیں رموز توحید سے کلّی طور پر آگاہ اور

روحانی حقایق سے بہرۂ وافر رکھتے ہیں) مجھ ضعیفہ کو بھی ہمیشہ سخنانِ حق ترجمان سے آگاہ کرتے اولیا اللہ اور مشایخ طریقت کے ذکر و اذکار سناتے اُن کے حالات و مقامات کا تذکرہ کرتے ان کے کرشمہ و کرامات اور خوارق عادات کو بیان فرماتے اور مجھے حق جوئی و حق شناسی کی سچی راہ کی طرف بُلاتے اور ان سعادتوں اور برکتوں کے حصول کی ترغیب دلاتے رہتے تھے یہانتک کہ سالِ مذکورہ میں حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی برادر موصوف کو ایک لشکر عظیم کی سربراہی عنایت فرماکر کابل کی طرف روانہ فرمایا اور کچھ وقت کے لیے اپنے اور اس قرۃالعین خلافت کے مابین مفارقت ظاہری کو ضروری خیال کیا۔

مجھ ضعیفہ اور میرے اس برادر مہربان و اخلاص نشان کے درمیان بھی جُدائی واقع ہوئی اور جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہورہے تھے تو گریہ و زاری سے میری بُری حالت تھی اور میں بہت ہی بیتاب و بے قرار ہورہی تھی اور میرے اس برادر عالی قدر پر بھی ایک گونا گریۂ بے اختیار طاری تھا بہر حال ہم گریہ کناں ایک دوسرے سے جدا ہوئے میں بہت دل تنگ و شکستہ خاطر ہورہی تھی۔

آں دل نماند کش سر بُستان و باغ بود
بارے ہمیشہ بسوختۂ درد و داغ بود

اب وہ دل کہاں رہا جس کو سیر باغ و چمن کی ہوس تھی وہ تو آتش فراق سے جل کر حرف درد و داغ رہ گیا تھا۔

اس وقت کے بعد میں ہمیشہ اپنا زیادہ وقت نماز روزے تلاوتِ قرآن پاک اور وظائف و دعا میں گزارنے لگی وقت وداع میرے برادر والا قدر نے نفحات الانس کے مطالعہ کی طرف مجھے خصوصیت سے توجہ دلائی تھی میں نے شہزادہ والا تبار کے مشورہ کے مطابق کتاب مذکور کو مصاحبِ دل اور حرزِ جان بناکر رکھا میں ہمیشہ اُسے اپنے مطالعہ میں رکھتی اور کبھی کبھی تو اپنی آنکھوں لگاتی اور کسی وقت اپنے سے جدا نہ کرتی۔

یہ کتاب اولیا کبار اور صوفیائے نامدار کے (سعادتوں سے بھرے ہوئے) حالات

پر مشتمل ہے ان بزرگوں کے اسما و اذکار کی برکت سے جو دین کے پیشوا تھے، مجھے بہت کچھ فیوض روحانی حاصل ہوئے اسی اثنا میں حضرت جہاں پناہ بھی کابل کی طرف توجہ فرما ہوئے۔ برادر والا قدر کے مکتوبات ملتے اور سفر و حضر میں موصول ہوتے رہتے تھے۔

میرے اس برادر والا گوہر نے راستہ میں، دو بزرگوں کی خاص طور پر زیارت کی تھی اور اُنکی حقیقت مجھے خطوں میں لکھ کر بھیجی تھی کہ میں اُن کے احوال سعادت اقبال سے آگاہ ہوجاؤں۔ ان میں سے ایک شاہ دولہ ہیں جو قصبہ گجرات خُرد میں تشریف رکھتے ہیں، دوسرے حاجی عبداللہ جو تال جلال گکھر کے آس پاس گوشہ گیری اختیار کیے ہوئے ہیں، جب میں گجرات پہنچی میں نے اپنے خواجہ سرا کو نذر و نیاز کے ساتھ شیخ دولہ کی خدمت میں روانہ کیا اور اظہار اخلاص کرتے ہوئے فیض و برکت کے لیے استدعا کی (کہ وہ حضرت شاہ دولہ کی ذات بابرکات سے مجھے حاصل ہو) لیکن جو میری خواہش تھی وہ پوری نہ ہوئی اور مجھے اُن کی بارگاہ سے کچھ نہیں ملا

اس کے بعد جب تال جلال گکھڑ کی حوالی میں گزر ہوا تو میں نے مذکورہ طریقہ پر حاجی عبداللہ کے پاس بھی اپنے خواجہ سرا کو تحفے تحائف کے ساتھ بھیجا اور ان سے بھی فیض بخشی کے لیے التماس کیا حضرت حاجی صاحب نے میری جانب سے پیش کیے جانے والے نذرانہ کو قبول کیا اور اس کے جواب میں مجھے ایک تسبیح بھیجی اور ایک رسمی ذکر کے لیے فرمایا کہ میں اُسے بطور شغل اختیار کروں۔

اسی کے ساتھ ایک جانماز بھی مرحمت فرمائی جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سی کر تیار کی تھی اور اسی کسب حلال سے وہ بسر اوقات کرتے تھے ان درویشانہ تحائف کے ساتھ دو نان بھی تھے جو میرے لیے بھیجے گیے تھے میں نے ان دو روٹیوں میں ایک روٹی کو توڑا اور اس میں سے چھوٹا سا ٹکڑا لیکر کھایا جیسے میں نے ذرا سا ٹکڑا کھایا میں نے اپنی صفائی، روشنی، دل جمعی حضوری اور طمانیت خاطر کا اثر محسوس نہیں کیا میں نے تین روز تک ان

روٹیوں کو اپنے پاس رکھا اور اپنی خادماؤں میں سے بھی اکثر کو اس میں سے دیا۔ حاجی عبداللہ نے کہا جاتا ہے کہ تیس سال ہوگیے اپنی رہایش گاہ سے قدم باہر نہیں نکلا۔

غرض کے چند منزلیں طے کرنے کے بعد حسن ابدال میں، کہ ایک بہت ہی پر فضا مقام ہے برادر عالی قدر والا گوہر سعادت مند دین و دنیا شہزادہ محمد دارا شکوہ سے ملاقات ہوئی میں نے ان کی محبت و ملاقات سے بہت کچھ فیض پایا اور برکت حاصل کی ان برادر نے مجھے کچھ ایسے تذکرے پڑھنے کا مشورہ دیا جو بزرگان دین اور مشایخ طریقت کے احوال و اذکار پر مشتمل ہے۔

میرا زیادہ تر وقت انہیں کتابوں کے مطالعے میں صرف ہوتا تھا یہ اللہ کا فضل تھا کہ میرے دل میں طلب حق کا جذبہ پیدا ہوا اور میرا دل دنیا اور دنیا کے بے فائدہ کاموں کی طرف سے سرد ہونا شروع ہوگیا میں اپنے دل میں کہتی تھی کہ خدا تعالے سمیع و بصیر (سننے والا اور دیکھنے والا ہے) اور علیم و خبیر ہے اور بندہ جو کچھ نیک و بد کہتا ہے وہ سنتا ہے اور جو کچھ اچھا بُرا عمل اس سے سرزد ہوتا ہے وہ اُسے دیکھتا ہے ہمیں مُنہیات اور غیر شرعی کاموں سے اجتناب اختیار کرنا اور جو عمر اسطرح فضول اور بیکار باتوں میں گزر گی اس پر افسوس کرنا چاہیے۔

انہیں ایّام میں کہ میرا عہد شباب تھا میں روز روز اپنے اعضا و جوارح کی قدرت و قوت میں کمی ہوتی ہوئی محسوس کرتی تھی اور میں یہ بات جانتی تھی کہ میرے حواس ظاہری معرض زوال میں ہیں جب میں نے جان لیا کہ اس مادی وجود کے لیے فنا لازمی ہے اور زندگی درد و غم کے سوا کچھ نہیں پس میں نے حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ و سلم) کو اپنے دل میں دہرایا :-

«موتو قبل ان تموتو» حدیث نبوی اپنی موت سے پہلے مرجاؤ

اور کہا کہ میں ایسی صورت میں، اپنے وجود کو ہستی فانی قرار دیکر، اپنے دل کو اس ذات مُقدس سے کیوں نہ لگاؤں، جو باقی اور دائمی ہے یہ بات میں نے اپنے جی میں ٹھان لی اور ان نمازوں کو دُہرانا شروع کیا جو زندگی میں مجھسے

رکھنا ہوتی تھی اور بعض اوقات میں، ان روزوں کو بھی ادا کرنا اور دوبارہ رکھنا چاہتی تھی جو میں کسی وجہ سے رکھ نہیں پاتی تھی، اب میں زیادہ تر وقت ذکر و شغل، اور احوال مشایخ کے مطالعہ میں صرف کرتی تھی اور اس طرح سفر کابل کی راہ، منزل بہ منزل طے ہورہی تھی۔

میرے والد بزرگوار اور برادر کامگار اس عظیم لشکر کی آسودگی کے خیال سے پیچھے چھوڑتے ہوئے جو آپ کے ہمراہ تھا، آگے بڑھ گیے، جب ہم کابل پہنچ گیے — اور برادر والا قدر بھی ایک قلیل مدّت کے بعد ہمارے ساتھ آگیے تو کثرت افواج کے سبب شہر کابل میں قحط کے آثار پیدا ہوگیے مجبوراً اس مہم اور اس مملکت کی تسخیر کا خیال ترک کردیا گیا جو اعلیٰ حضرت کے پیش نہاد خاطر تھا اور جس کی سربراہی برادر والا قدر کو سونپی گئی تھی اور لشکر ظفر اثر نے کابل کی طرف رُخ کیا تھا۔

اس عطیہ غیب کی ظہور پذیری سے مجھے جس قدر مُسرت و شادمانی حاصل ہوئی میں اُسے بیان نہیں کرسکتی۔ میں نے بارگاہ ایزدی میں ہزار در ہزار سجدہ ہائے شکر ادا کیے اور جس بات کے لیے میں خُدا سے دُعا مانگتی تھی وہ مجھے اپنے برادر کامگار کی تھوڑے دنوں کی جُدائی کے بعد میسر آگئی۔

اب اکثر میں اپنے اس برادر والا نژاد کے ساتھ بیٹھی رہتی اور ہم لوگ باہم حق شناسی و خدا جوئی کی باتیں کرتے رہتے تھے اور اس مراد کے حصول کے لئے میرا ذوق طلب ایک کے مقابلے میں ہزار گنا بڑھ گیا اور معرفت الٰہی کی آتش شوق نے میرے دل کو بے طرح روشن کردیا۔

کابل میں کچھ وقت گزارنے کے بعد اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) جو عنایت ایزدی سے بے انتہا قریب ہیں، مراجعت لاہور پر آمادہ ہوگئے اور ایک ہزار و چہل و نہم ہجری النبوی میں ماہ رجب کی ١٤ تاریخ کو شہر مذکور میں داخل ہوئے ادراکِ حقیقت و عرفان الٰہی کے لیے میرا شوق برابر بڑھتا جارہا تھا — چونکہ شہر لاہور میں بہت سے مشایخ طریقت اور بزرگان دین

سکونت پذیر و قیام فرما ہیں اور مجھے ایسے کسی مرشد کی جستجو تھی جو مجھے معرفتِ الٰہی کی راہ راست پر لگادے اور رموزِ توحید سے آگاہی بخشے۔

میں نے اپنے دل میں تہیّہ کرلیا کہ جب تک مجھے کوئی مرشد کامل نہیں مل جائیگا اور میں اسے اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لونگی اور اس کے حالات، و مقامات، اچھی طرح، میرے دل پر ظاہر نہ ہوجائینگے، نیز جب تک میرے عالی قدر برادر شہزادۂ دارا شکوہ اس سے مطلع اور مطمئن ہوکر مجھے بیعت کی اجازت نہیں دینگے میں چین سے نہ بیٹھونگی۔

میں خاص طور پر مشایخ چشت کی طلب و جستجو میں تھی اور جہاں بھی میں کسی گوشہ نشین بزرگ یا کسی شیخ وقت کے بارے میں سنتی تھی اپنے آدمیوں کو بھیج کر اس کے حال و احوال کی جستجو کرتی تھی اور ان کے حالات و کوائف سے مطلع ہوکر ان کے پاس نذر و نیاز بھیجتی تھی اور ان سے کسی شغل و ذکر کی خواہش کرتی تھی۔ بعض اکابر سے شغل و ذکر کے کچھ طریقے بھی معلوم ہوے لیکن کوئی بھی دِل نشین و خاطر نشان نہ ہوا اور اس سے مجھے کوئی روحانی فائدہ نہیں پہنچا۔

مجھے حضرت میاں میر کے یاران طریقت و اہل ارادت کے بارہ میں اکثر اطلاع یابی کی خواہش و کوشش رہتی تھی، میں نے خاص طور پر اس ضمن میں خواجہ بکھاری سے رجوع کیا (جو حضرت میاں جیو کے احباب اور وابستگانِ سلسلہ میں ہیں) اور بہت الحاح و زاری کے ساتھ ان سے التماس کیا۔ حضرت خواجہ بکھاری خود کسی کو مرید نہیں کرتے اور اب تک اُنکا کوئی مرید ہے بھی نہیں انہوں نے مجھکو بھی «مشغول» نہیں فرمایا لیکن چونکہ وہ مجھ ضعیفہ پر مہربانی فرماتے تھے، میں گاہ گاہ انکی خبر گیراں رہتی تھی۔

ایک مُدّت اسی جستجو اور گفتگو میں گذر گئی لیکن مجھے کوئی ایسا شیخ نہیں ملا، جس کے ارشاد و تلقین سے میں اپنی دل کو تسلی دے سکوں اور جسکی رہنمائی پر پوری طرح، اپنی طمانیت خاطر کا اظہار کرسکوں۔ میری یہ

ناپائندگی۔ اس لیے تو نہ تھی کہ آج دنیا ایسے اہل اللہ کے وجود سے خالی ہوگی ہو۔ ایسا نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا یہ دنیا اللہ کے نیک بندوں اور خدا رسیدہ اشخاص سے نہ پہلے خالی تھی نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی۔ یہ دنیا تو اُنہیں کے وجود مسعود سے قایم ہے۔

اگر فی العقل یہ عالم ظاہر اولیاء اللہ کے وجود سے ایک ساعت کے لیے بھی خالی ہوجائے جو اللہ کے نجیب و نقیب ہیں جو نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہیں۔ اور جن میں کوئی ابدال ہے کوئی قطب ہے اور کوئی غوث وقت ہے (رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین) یہ نہیں تو پھر مدار عالم بھی اپنی جگہ باقی نہیں رہیگا اور دنیا و مافیہا کا سارا نظام درہم برہم ہوجائیگا۔

چونکہ شیخ کامل کی تلاش سالک کے لیے فرض عین اور عین فرض ہے اس لیے ایسے کسی بزرگ کے بارے میں خبر سننے کے لیے میں ہمیشہ گوش بر آواز رہتی تھی اور دیدۂ انتظار کو ایسے کسی بھی پیر کامل کی جستجو میں ہمیشہ کُھلا رکھتی تھی۔ جبتک کوئی راہ حق کا جویا کسی عارف ذات تک نہیں پہنچتا عرفان حق کی منزل مراد تک اُسکی رسائی معلوم اسے امر محال تصور کرنا چاہیے کہ وہ کسی پیر کی رہنمائی کے بغیر حقیقت الحقایق تک پہنچ جائے۔

اگرچہ میری خواہش یہ تھی کہ اس طرح کا کوئی مرد کامل طریقۂ چشتیہ میں میسّر آجائے کہ یہی میرے حق میں سب سے بہتر ہوگا اور اس سلسلۂ عالیہ سے وابستہ ایسے بہت سے شیخ وقت اور پیر طریقت ہونگے جنکو عارف حق واصل بحق اور دانائے ذات مطلق کہا جاسکے اور اس سلسلۂ شریفہ کے رتبہ کی بلندی اور درجات کی برتری اس سے کہیں زیادہ ہے کہ اس کی تعریف و توصیف کی جاسکے

لیکن چونکہ اس فرقہ کے مشایخ مستور الاحوال رہتے ہیں اور خود کو دوسروں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھتے ہیں میں یہ نہ کرسکی کہ ان میں سے کسی کے حال سعادت مآل کے بارہ میں جلد سے جلد کوئی اطلاع پاسکوں اور میری

عمر عزیز ہے۔ کہ گذری جارہی ہے جسکا ہر لمحہ ایک متاع بے بہا ہے اور جب وقت کا کوئی حصہ گزر جاتا ہے تو پھر وہ کسی طرح واپس نہیں ملتا اس پر بھی میری زندگی کے بیش قرار ساعتیں اور لمحے یونہی بے حاصل اور بے مصرف بیتے جارہے ہیں میری عمر اس وقت ۲۷ برس ہوگئی ہے اس لیے زندگی کا جو سانس آتا اور جاتا ہے اس کے ساتھ یہ خواہش اور بھی شدید ہوتی جاتی ہے کہ جس سلسلہ میں بھی کوئی عارف کامل اور مرشد طریقت مل جائے میں اس کا دامن تھام لوں۔

چونکہ میں اپنی طلب میں صادق اور اپنے ارادہ میں ہر طرح مضبوط تھی اور اللہ جل شانہ بھی کہ معبود برحق اور خداوند مطلق ہے یہ چاہتا تھا کہ یہ ضعیفہ نحیفہ جو اسکی درگاہ ازلی و لم یزلی کی سوالی ہے، محروم و مغموم نہ رہے اور اپنی مراد کو پہنچے اور حقیقت الحقایق کی دریافت اور اسرار توحید و رموز یگانگت کی نکتہ شناسی کی سعادت (کہ زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے) سے بہرہ مند ہو۔

بنابریں ان ہی ایام میں حضرت ظل سبحانی آئینہ رحمت ربانی اعلی حضرت صاحب قران ثانی خطۂ دلپذیر کشمیر کی سیر کی طرف توجہ فرما ہوئے یہ حسین و دلکش سرزمین اپنی آب و ہوا کی خوبی کے لحاظ سے کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں انہیں کے ساتھ یہ ضعیفہ بھی، ماہ ذی الحجہ سنہ مذکور کی ۹ تاریخ کوکشمیر جنت نظر پہنچی میں اس علاقہ کے مشایخ اور اہل اللہ کے احوال پرکوئی اطلاع نہ رکھتی تھی۔ کشمیر پہونچنے کے قریبی زمانے میں نے سنا کہ شہر کشمیر آج حضرت ولایت پناہ بزرگیدۂ الٰہ ملا شاہ بدخشی کے وجود مسعود سے رشک آسمان و زمین بنا ہوا ہے اور یہ خطۂ پاک آپکے مبارک قدموں کی برکت سے ہم سر سپہر بریں نظر آتا ہے اور دعوے یکتائی رکھتا ہے اور حضرت والا حضرت میاں میر قدس سرہ الشریف کے سلسلۂ عالیہ سے وابستہ ہیں اور آپ کے بہترین دوستوں اور اہل ارادت میں سے ہیں حضرت میاں میر کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ حضرت والا قدر سر دفتر اولیاء کبار ومشایخ نامدار ہیں۔ آپ دلوں کا بھید جانتے، ظاہر و باطن پر اطلاع رکھتے ہیں اور صغیر و کبیر کے پیشوا اور عرب و عجم کے مقتدا ہیں۔

اور برادر عالی قدر، کامگار، صاحب کشف و اسرار، حقیقت شناس و حق پژوہ شہزادہ محمد داراشکوہ بھی کہ دراصل اس ضعیفہ کہ مرشد و رہنما ہیں، حضرت میاں جیو سے نسبت ارادت رکھتے ہیں اور ان ایام سعادت فرجام میں لوگ حضرت ملا صاحب کی خدمت بابرکت میں آمدورفت رکھتے ہیں۔ اُنکو حضرت نے مشغول بحق فرمایا ہے انہوں نے حضرت والا سے بہت کچھ کسب فیوض و برکات کیا ہے جس سے وہ صاحب حالات عالیہ و مقامات عالیہ ہوگیے ہیں اور انہوں نے، تصور وحدت کے مرتبہ بلند اور مقام توحید کے مدارج ارجمند کے شناسائی میں رتبۂ کمال حاصل کیا ہے اور قرب حضرت ذوالجلال کے روشن حلقہ تک اُنکی رسائی ہوئی ہے۔

اپنے برادر والا گوہر کی زبان حقیقت ترجمان سے بھی میں نے حضرت ارشاد پناہ سعادت دست گاہ مُلا شاہ کی بار بار تعریف سنی تھی نتیجہ یہ کہ میں بے حد صدق عقیدت اور عشق و ارادت کے ساتھ دل و جان سے حضرت کی روحانی شخصیت کی طرف مائل ہوگی اور اس حدیث نبوی کے مصداق — کہ جس نے کسی شئے کو طلب کیا اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کی اس نے اسے پالیا۔

« من طلبَ شیأً وجدَ وجدَ »

اور اس طرح میں اپنے مطلوب و مقصود پر فائز ہوگی۔

اور ایک معنی میں گستاخی کرکے چند روز کے اندر اندر میں نے دو تین عریضے اظہار عقیدت و اخلاص کے طور پر حضرت والا کی خدمت میں ارسال کیے اور ان میں یہ شعر بھی لکھا :-

گر میسر شود آں روے چو خورشید مرا
بادشاہی چہ کہ دعواے خدائی بکنم

اور نذر و نیاز کی صورت میں کسی پیش کش کو سوے ان خیال کرتے ہوئے پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے روٹی پکائی اور ساگ تیار کیا میں نے اور اپنے معتمد خواجہ غریب کے ہاتھ اُسے بھیجا۔

شروع شروع میں حضرت نے بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے میرے عریضہ کا کوئی جواب مرحمت نہ فرمایا اور بڑے استغنا سے کام لیا. لیکن میرے عریضوں کو آپ ملاحظہ ضرور فرماتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہمیں دنیاداروں اور بادشاہوں سے کیا واسطہ. یہ ضعیفہ اس پر بھی عریضوں کی ارسال کردگی اور اور خدمت گزاری کے مواقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی اور برادر والا قدر بھی جب باریاب خدمت ہوتے تو میری اخلاص مندی اور حسن عقیدت کو ظاہر فرماتے رہتے.

جب حضرت والا نے اس ضعیفہ کو اپنے کشف باطن سے، صحیح معنی میں اپنا ارادت مند اور طلب حق میں سچا پایا اور انہیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ میرا مطلب تلاش حق کے ماسوا کچھ نہیں تو آپ آمادۂ لطف و کرم ہوئے اور میرے عریضوں کے جواب پر کم کم توجہ فرمائی شروع کی.

اور مجھے یہ پوری امید ہوئی کہ میں حضرت کے رشد و ہدایت کی بدولت اپنے مقصد اصلی و معرفتِ حقیقی میں کامیاب ہونگی (انشاءاللہ تعالےٰ)

اور جیسے جیسے برادر عالی قدر کی سچائی سے بھری ہوئی باتوں کے ذریعہ مجھے حضرت کے علوے درجات اور مراتب عالیہ کے بارہ میں میری معلومات بڑھتی گئیں حضرت کے جمال مبارک کو میں نے کچھ قریب سے اس وقت دیکھا تھا جب حضرت ظل سبحانی، کی حسب الخواہش حضرت والا نے شاہی قیام گاہ پر اس کریمہ کے بموجب تشریف لانا قبول کرلیا تھا

اطیعوا اللہ واطیعو الرسول و اولی الامر منکم

اللہ کی اطاعت کرو اس کے رسول (مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور اسکی اطاعت کرو جو تم سے صاحب امر ہو. نیز اس حدیث نبوی کے مطابق «اذا دعا فلیجب» کہ جب کوئی دعوت دے تو اسے قبول کرو.

جب حضرت رونق افزاے کاشانۂ علیا ہوئے تھے تو میں نے ایک دوسری

جگہ سے آپ کو دیکھا تھا آپکی نورانی پیشانی سے جو شعاعیں پھوٹ رہی تھیں دیدۂ حق بین و چشم عقیدت آئین کے لیے وہ جلوۂ خیرگی پیدا کرنے والے تھے اور حضرت کے اس دیدار کی برکت سے میرا اعتقاد حضرت کے بارہ میں بہت بڑھ گیا تھا۔

اب ایسی صورت میں میں نے جو اپنے دل میں شرطیں رکھی تھیں کہ جب تک ایسے کسی شخص کو اپنے آنکھ سے نہ دیکھ لونگی اور اس کے احوال کو اپنے عالی قدر بھائی کی زبانی نہ سن لونگی اب یہ شرطیں گویا پوری ہوگئیں اور ریب و شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو میں نے اپنے برادر والا گوہر کی وساطت سے حضرت کے دامن سعادت کو اپنے دست ارادت سے تھام لیا اور آپ کو اپنا مرشد حقیقی بنالیا۔ اور حضرت نے بھی کمال عنایت و مہربانی کے ساتھ [جو اچھے اور سچے مرشدوں کا ایسے مریدوں کے سلسلہ میں جو طالب صادق رکھتے ہیں خاص شیوہ ہوتا ہے] مجھے اپنے دامن عاطفت کے سایہ میں لیا اور وہ اشغال و اذکار جو [سلسلۂ قادریہ اور طریقۂ شاہیہ میں معمولات کا درجہ رکھتے ہیں] مجھے تلقین فرمائے، اور حضرت والا کے ارشاد و ہدایت کے مطابق برادر والا قدر نے وہ مجھ تک پہنچائے اور مجھے مشغول کیا۔

اور جس روز کہ میرے برادر عالی قدر نے حضرت والا کے ارشاد کے بموجب اور طریقۂ شاہیہ اور سلسلۂ عالیہ قادریہ کے ضابطۂ روحانیت کے مطابق مجھے مشغول کیا اور اسی کے ساتھ اسکو بھی میرے لیے خاطر نشان بنایا کہ میں حضرت والا، حضور رسالت پناہ، خلفائے راشدہ اور دوسرے اولیاء اللہ کا تصور کیسے کروں اسی روز میں نے غسل کیا اور پاکیزہ لباس پہنکر روزہ رکھا اور شام کے وقت اس مہی کے پھل سے جو حضرت والا نے میرے لیے بھجوایا تھا، روزہ افطار کیا اور تھوڑا سا وہ کھانا کھایا جو صحیح معنی میں درویشانہ کھانا تھا یہ ملا محمد سعید کے یہاں سے آیا تھا اور حضرت والا خود بھی اکثر ملا محمد سعید کے گھر سے آئے والا کھانا ہی تناول فرماتے ہیں۔

بعد ازاں میں اس مسجد میں گئی جو میری رہائش گاہ کے ایک حصہ میں

ہے اور نصف شب تک وہاں عبادت گزاری اور اوراد و وظائف میں مشغول رہی اور نماز تہجد ادا کرکے وہاں سے اپنی خوابگاہ میں آئی۔ اور میں ایک گوشہ میں قبلہ رو بیٹھ گئی اور اپنے مرشد کی شبیہ مبارک، حضور پرنور ورسول مقبول صلی اللہ علیہ اور آپ کے ذی قدر صحابہ اور اولیاء اللہ کی صحبت میں حاضر ہونے کا تصور کرکے ذکر و شغل میں محو ہوگئی۔

جب میرے دل میں یہ خطرہ گزرتا ہے کہ میں تو سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوئی ہوں اور ذکر و شغل میں، طریقۂ قادریہ کو اختیار کیا ہے ایسی صورت میں مجھے طمانیت خاطر اور کشایش احوال میسر آئیگی یا نہیں لیکن جیسے ہی میں متوجہ ہوئی مجھ پر ایک ایسی حالت طاری ہوگئی جسے نہ خواب کہا جاسکتا ہے نہ بیداری، میں نے حضرت رسالت پناہ کی مجلس مقدس کو دیکھا جو آپکے چہار یاروں صحابۂ کرام اور اولیاء کبار سے اس طرح مزین تھی جیسے آسمان چاند ستاروں سے ہوتا ہے اور میرے مرشد والا حضرت ملا شاہ اور میرے قابل احترام بھائی شہزادۂ دارا شکوہ بھی اس میں موجود ہیں اور آنحضرت [صلی اللہ علیہ وسلم] اپنی زبان صدق ترجمان فرما رہے ہیں "اے ملا شاہ تونے خاندان تیموریہ کا چراغ روشن کردیا ہے۔"

جب اس حالت سے واپس آئی تو میرا دل اس بشارت سے باغ باغ ہورہا تھا پھول کی طرح کھلا جارہا تھا میں نے بارگاہ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کیا اس رباعی کا مضمون میری زبان پر تھا

حقّا توئی آنکه می رساند شاہا
فیض نظرت طالبانرا نجدا
ہر که نظر کنی به مقصود رسد
نور نظر تو شد مگر نور خدا

اے بادشاہ وہ تو ہی جس کا فیض نظر کمالِ صفا و نورانیت کے باعث طالبان حق کو اُنکی منزلِ مراد تک پہونچا دیتا ہے تیری نگہ التفات جسپر پڑتی ہے وہ

وہ اپنے مقصود کو پہنچ جاتا ہے گویا تیری آنکھوں کا نور خدا ہی کا نور ہے

اس وجہ سے کہ میں نے رسالت مآب اور آپکے اصحاب و احباب کی زیارت کی تھی اور حضور کی زبان معجز بیان سے یہ کلمۂ بشارت بھی میں نے سنا تھا (کہ اے ملّا شاہ تو نے خاندان تیمور کے چراغ کو روشن کردیا ہے اور میں یہ بھی جان چکی تھی کے یہ ارشاد سوت میرے دل میں پیدا ہونے خطرات و خدشات کو دور کرنے کے لیے تھا۔

اور یہ میرے امیرے قابل صد احترام بھائی کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے اس لیے کہ خاندان تیموریہ کے ہمیں دو افراد ہیں میں اور میرے برادر والا قدر شہزادۂ داراشکوہ، جنھوں نے طلب حق کی راہ میں قدم رکھا ہے اور اپنے دستِ ارادت سے مرشد والا جاہ حضرت ملا شاہ کا دامن پکڑا ہے میرے اسلاف میں سے کوئی شخص بھی اس سعادت کو حاصل نہیں کرسکا اور کسی نے بھی ہم دونوں بہن بھائی کی طرح حق جوئی کی راہ میں، قدم نہیں رکّھا میں اللہ پاک کا ہزاران ہزار شکر ادا کیا اور اس وقت میں اس قدر خوش تھی کہ میرے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔

میرا اعتقاد اس دولت بیدار کے باعث ہزار گنا بڑھ گیا، میں نے عقیدت کا یہ پٹکا گویا دس جگہ اپنی کمر سے باندھ لیا اور حضرت مرشد کہ حلقۂ ارادت کو گوش جاں میں پہن لیا۔ اور صمیم قلب سے حضرت والا کو دین و دنیا میں اپنا مرشد و مقتدا بنا لیا اور اپنے لیے اس شرف و امتیاز کا خیال کرکے اللہ پاک کی بارگاہِ رحیمی اور درگاہِ کریمی میں بہت بہت شکر بجالائی اور اپنے دل میں کہا کہ یہ کتنی بڑی سعادت اور موجب صد برکت ایک صورت ہے جو اس ضعیفۂ بے بضاعت کے حق میں ظہور پذیر ہوئی اور یہ بہترین دولت ہے جو میرے برادر والا قدر کے حصہ میں آئی اور میرے اس بھائی کی توجہ اور توسّط سے مجھ فقیرۂ راہ طلب کو نصیب ہوئی وہ اس سے پہلے تیموری خاندان کے افراد میں سے کسی کہ حصہ میں نہیں آئی تھی۔

اور دو روز کم چھ ماہ شہر کشمیر جنت نظیر (سری نگر) میں میرا مقا

رہا اور اس اثنا میں میں نے اپنے مرشد کی خدمت میں بہت سے نیاز نامے اور عقیدت سے بھرے ہوئے خط ارسال کیے حضرت والا نے بھی ازراہ عنایت بے نہایت اکثر راقمۂ عاصمہ کو اپنے جواب با صواب سے سر بلندی بخشی۔

اگرچہ حضرت والا کو اس دنیائے فانی کی لذتوں اور فائدوں کی طرف سے کمال بے نیازی و بے احتیاجی حاصل ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ آپ آخرت کی نعمتوں سے بھی [خوشنودی باری تعالیٰ کے سوا] بے توجہی و استغنٰے رکھتے ہیں لیکن یہ ضعیفہ حصول سعادت دارین کی غرض سے اپنے مرشد کامل حضرت ملا شاہ کو کبھی خوشبوؤں کا تحفہ بھجواتی اور کبھی طرح طرح کے کھانے اپنے ہاتھ سے تیار کرکے حضرت کی خدمت میں روانہ کرتی، اگرچہ میں خلاف سنت باتوں سے احتساب کو ضروری خیال کرتی رہی ہوں پھر بھی میں نے اپنے مرشد کے دیدار پر انوار سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا۔

ہزاراں ہزار تعریفیں اس ذات باری کے لئے ہیں جو اپنے مرتبۂ احدیت میں فرد ہے اور اس کی الوہی صفات ہر طرح کے شرک اور تشبیہ و تمثیل کے رشتے سے بالا تر ہیں۔ کہ یہ حقیرۂ بے بضاعت کہ حس بے اپنے سنین عمر کو فضول باتوں میں ضائع اور اپنے اوقات شریف کو بے مصرف سر کیا، یہ محض اس کا کرم اور غیبی تائید تھی کہ اپنی طلب اور ترک علایق کے اس درجہ عالی سے سرفراز کیا اور اس کی وحدت کے ادراک کی دولت سے مجھے دین و دنیا میں ارجمند کیا اور میری تشنگی کو بحر حقیقت کی موج زلال اور سرچشمۂ معرفت کے جرعۂ شیریں سے سیراب کیا۔ اور میں امید رکھتی ہوں کہ اللہ پاک اپنے کرم بے حساب اور لطف بے پایاں سے اس دولت لازوال اور اس نعمت غیر مترقبہ سے کہ مجھے حاصل ہوئی ہے تا دم واپسیں مجھ ضعیفہ کو خوش حال اور اس حقیرہ کو مالامال رکھیگا اور اس صراط مستقیم پر کہ جو حضرت حق تک رسائی کا سب سے قوی وسیلہ ہے، مجھے چلتے رہنا نصیب ہوگا۔ اور مجھے ان تمام اشغال و اذکار کی توفیق، اس کمترین خلایق کو اس کی بارگاہ سے کی جاتی رہیگی جو اس سلسلۂ شریفہ اور طریقۂ شاہیہ کے معمولات میں سے ہیں۔ اور اپنی یاد کو

لذت کو اس بے بضاعت کے کام جان کے لئے شیریں بنائیگا اور اپنی بخشش لازوال کے طور پر اپنے ذوق طلب کو میرے اخلاص نشان دل میں دن بدن بڑھاتا رہیگا۔

اور میرے مرشد والا حضرت ملا شاہ [کہ میری جان آپکے نام پر فدا ہو] اپنے مریدوں اور راہ حق کے طلب گاروں پر بے انتہا لطف و شفقت فرماتے ہیں اور آپکی مہربانیاں مجھ ضعیفہ پر تو بے حد اور لانہایت ہیں اور جو کرامات حضرت والا نے مجھ فقیرۂ نحیف کے حال پر توجہ فرماتے ہوئے لکھے ہیں وہ آپ کی بے پایاں توجہات و عنایات کے آئینہ دار ہیں۔ اور ان کی سطر سطر حکیمانہ نکات اور عارفانہ اشارات سے مزین ہے اور توحید و رموز معرفت کو اس صراحت و وضاحت کے ساتھ مجھے سمجھایا ہے جس کی توقع کسی بھی بڑے مرشد سے کسی ادنے مرید کی تربیت کے سلسلہ میں کی جاسکتی ہے اور اس سے مجھ ضعیفہ کو بے شمار فائدے میسر آئے ہیں۔

میرے مرشد کا طریق حق حقِ معرفت کو دل نشیں و خاطر نشاں بنانے میں بے نظیر و بے مثال ہے اور حضرت والا کی نظر کیمیا اثر میں تاثیر کا یہ روشن عنصر عطیۂ خداوندی ہے آپنے اکثر تبرکات بھی اس حقیرہ کے لئے بھیجے ہیں

اور کشمیر سے واپسی میں جب دو تین دن رہگئے تھے، پنجشنبہ کی رات کو میں حضرت کی صورت مبارک کا تصور کرکے مراقبہ میں بیٹھی اور میں نے دل کی آنکھوں سے حضرت والا کی شبیہ مبارک کو دیکھا اس حالت میں، حضرت کے دوش مقدس پر جو رولیہ پڑا رہتا ہے میں نے اس کے لئے التماس کیا کہ وہ مجھے عنایت کیا جائے۔ صبح کے وقت میں یہ چاہتی تھی کہ حضرت والا کی خدمت میں عریضہ لکھ کر یہ درخواست کروں کہ وہ روئیہ مجھے عنایت کیا جائے کہ اتنے میں میرا خواجہ سرا جس کا نام پران ہے اور جو حضرت کی خدمت اقدس میں آتا جاتا رہتا ہے وہ آیا اور اس نے کہا کہ میں کل شام حضرت کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ آپ نے نماز مغرب کے بعد رولیہ اتارا اور مجھے عنایت کیا اور فرمایا کہ اسے فلاں عزیزہ کو دیدیا جائے میں نے فوراً وہ روئیہ خواجہ

سرا سے لے لیا اپنی آنکھوں سے لگایا سر پر رکھا۔ مجھے بے حد سرور و حضور حاصل ہوا۔

اگرچہ یہ بھی حضرت والا کی ایک کرامت تھی مگر حضرت کی ذات والا صفات سے ایسے خوارق عادت کا ظہور کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اللہ پاک نے مرتبۂ ولایت اور توجہ کرامت میں جو قوت و قدرت میرے مرشد کو عطا فرمائی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ جو چاہیے وہ کر سکتے ہیں۔ اور اس مرتبہ پر فائز ہوکر آپکی ذات سے خوارق کی نمود ایک معنی میں دون ہمت اور آپکے درجات عالیہ سے فرد تر ہے میرے اشارے پر ایک شاعر نے حضرت کے بارہ میں یہ رباعی لکھی ہے

اے ہستی تو ہستی مطلق گشتہ
اسرار نہاں بر تو محقق گشتہ
حاجت زتو خواستن زمق خواستن است
چون جملہ صفات، صفت حق گشتہ

اے کہ تیری ہستی گویا ہستی مطلق بن گی ہے اور اسرار انہیں تجھ پر محقق ہوگیے (یہ تحقیق تجھے معلوم ہوگیے ہیں) تجھسے کچھ مانگنا گویا خدا سے مانگنا ہے اس لیے کہ تیری تمام صفات حق تعالیٰ کی صفات بنگی ہیں۔

یہ ضعیفہ دو بار حضرت مرشد کی زیارت سے فیض یاب ہوئی ہے اور اپنے دیدہ و دل کو حضرت والا کے جمال باکمال سے روشن کیا ہے ایک بار اپنے بھائی کے ساتھ اور دوبارہ جب میں سری نگر سے سفر لاہور پر روانہ ہوئی تھی، میں نے عریضہ لکھ کر حضرت سے 'التماس کیا تھا' کہ چونکہ اب روانگی طے ہوچکی ہے اس لیے درخواست ہے کہ حضرت والا کرم فرما کر مجھے اپنے دیدار فیض آثار سے مشرف فرمائیں جس سے مجھے ظاہر و باطن کے فائدے حاصل ہوں۔

حضرت والا نے اس فقیرہ کی درخواست کو کمال شفقت وعنایت کے ساتھ

قبول فرمایا، میری جان اس خاک پر فدا ہو جو آپ کے گھوڑے کے سموں سے اڑتی ہے۔

اس فقیرۂ ضعیف کی پیش‌کش قبول فرما کر اور میری روانگی کے موقع پر اس راہ کے نزدیک جہاں سے مجھ ناچیز کو گزرنا تھا ایک توت کے درخت کے نیچے سُرخ رنگ کا پٹو بچھاکر آپ بیٹھ گئے، میں خود ہاتھی پر سوار تھی اور عماری میں بیٹھی تھی

جب میں اس درخت کے قریب پہنچی تو ہاتھی کو ٹھہرایا گیا تا کہ میں اس مرشد مہربان کے جمال جہاں آرا کو دیکھ سکوں، جو آسمان کے چاند اور چمکتے ہوئے سورج کی طرح دنیا کو فیض پہنچانے والا تھا۔ پردۂ عماری سے میں نے اپنی آرزوے دید اور جذبۂ عقیدت سے بھری ہوئی خواہش کے ساتھ حضرت کے چہرۂ پرنور کا دیدار کیا اور فیوض و برکات سے اپنا دامن بھرا۔

حضرت کے علوے شان کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور آپکی روشن پیشانی سے جو شعاعیں نکل رہی تھیں ان سے میری آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور غلبہ شوق کی وجہ سے میرا رونگٹا رونگٹا جیسے کانپ رہا تھا جیسا کہ اس رباعی سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو ایک شخص نے مجھ خاکسار ہے حقدار کے کہنے کے مطابق لکھی تھی۔

اے شاہ کہ ملک عافیت کشور تست
ہر بخیۂ دلق تو، صف لشکر تست
آئینہ حق نما بہ روے تو بود،
خورشید خجل زیبا کی گوہر تست

اے بادشاہ ملک عافیت تیری مملکت ہے اور تری گدڑی کا ہر بخیہ تیرے شکر فقر و درویشی کی ایک صف ہے۔ تیرا چہرۂ مبارک آئنۂ حق نما ہے اور تیرے گوہر ذات کی پاکیزگی و درخشانی کے مقابلہ میں آفتاب صبح خجل نظر آتا ہے۔

اور اس وقت حضرت والا کی خدمت میں تین شخص حاضر تھے ایک محمد حلیم جسے آپ نے اپنی فرزندی کے خطاب سے ارجمند و سر بلند فرمایا ہے اور وہ آپکی توجہات کی برکت سے کمال عرفان اور توحید باری کی نکتہ شنا کے مرتبۂ بلند تک پہنچایا ہے اور اسی کے ساتھ وہ کشمیری خادم جن میں ایک کا نام حسن اور دوسرے کا خضر تھا۔ یہ دونوں حضرت کے عقب میں تھے اور حضرت والا کے گھوڑے کی لگام ان میں سے ایک کے ہاتھ میں تھی اس کے بعد میں نے ایک شیشۂ گلاب اور پان کے چند بیڑے خواجہ سرا کے ہاتھ حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ اور یہ خواہش کہ شیشہ حضرت والا سے الوش کراکے میرے لیے واپس لے آئیں کہ وہ میرے دل کو صفائے تازہ بخشے عالم ظاہر میں حضرت کی خدمت سے جدا ہوکر میں چشم گریاں اور بیقرار دل کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئی۔

اس کے بعد حضرت والا بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگیے اور یہ فقیرۂ ضعیف اپنے عقیدہ کی اس دولت کے ساتھ جو ایمان مجمل و ایمان مفصل میں بیان ہوئی ہے ، اللہ کی وحدت اور اسکی یکتائی پر ایمان کامل رکھتی ہے جو تشبیہ و تمثیل کے رشتے سے آزاد ہے۔ جو پاک ہے ، مطلق ہے ، لامحدود ہے ، محیط ہے۔ علیم ہے ، قدیر ہے ، سمیع و بصیر ہے وہی اول ہے وہی آخر ہے ، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور اپنی تمام الوہی صفات کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ اس حقیقت کو برحق مانتے ہوئے اپنے پیر دستگیر کی رہنمائی پر اعتقاد راسخ رکھتی ہے۔

اور اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اپنے پیر دستگیر اور مرشد کامل کی توجہ کی برکت سے مجھے ایمان حقیقی کی دولت میسر آگئی۔ اور حق شناسی و عرفان ذات کی منزل مل گئی جس کا مطلب خداوند قدوس کی ذات کو یکتا و مطلق ماننا اور اسکی ازلی و ابدی صفات کو لانہایت و نامحدود تصور کرنا اور یہ سمجھ لینا کہ ایک دن یہ تمام کائنات اسی کی ذات واحد میں سمٹ جائیگی اور اسی کی ہستی باقی رہیگی جو واجب الوجود ہے۔

اسی کے ساتھ مجھ پر یہ حقیقت بھی روشن ہوئی کہ انسان کو جنوں اور فرشتوں پر اس لیے فضیلت دی گئی ہے کہ وہ ذات باری کی شناخت اور اس کی الوہی صفات کی دریافت کی صلاحیت رکھتا ہے اب جو انسان اس صلاحیت سے عاری اور شناخت کی اس قابلیت سے محروم ہے وہ انسان نہیں بلکہ قران پاک کے الفاظ میں وہ کالانعام میں سے ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہے

اولٰئک کالانعام بل ھم اضلّ

اور اس کی زندگی ہیچ ہے اور اسکا انسانی وجود لایعنی اس کے مقابلے میں جو ذات حق کی شناخت کے اس مرتبہ پر فائز ہوگیا اور اس سعادت عظمٰے سے مشرف ہوا وہی افضل موجودات اور اشرف مخلوقات بن گیا۔ اسکی ھستی ھستی مطلق میں گم ہوگی قطرہ سمندر میں مل گیا اور ذرہ آفتاب کا حصہ بن گیا اور جزو کل میں بدل گیا۔ پس اس حالت میں وہ حدوث، تصور عذاب، سوال و جواب اور بہشت و دوزخ سے چھوٹ گیا۔ سبحان اللہ امتِ سید خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اولیائے کرام اور فقرائے ذوی الاحترام کا مرتبہ کتنا بلند ہے جن کے لیے کہا گیا ہے «یُحبھم و یحبّونہ» میں ان سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھسے محبت کرتے ہیں اب اس میں عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

یہ اللہ پاک کا فضل ہے وہ جس کو چاہے عطا کردے اور جو شخص کہ ذات مطلق سے عشق و محبت کا رشتہ رکھتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت حضرت شیخ فرید الدین عطار قدس سرہ نے حضرت رابعہ بصری کے لیے فرمایا ہے وہ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی ہزار مردوں سے بہتر ہیں کہ وہ سر سے پاوتک درد عشق میں ڈوبی تھیں اور اس سعادت عظمٰے اور نعمت عالی کو اس فقیرۂ ضعیف نے اپنے برادر عالی قدر عارف ذات و دانائے صفات، محمد دارا شکوہ کے وسیلہ سے حاصل کیا ہے۔

یہ عاجزہ لطف خداوندی سے یہ آرزو رکھتی ہے کہ میرے دل میں عشق و

محبت کا یہ جــذبہ بڑھتا رہیگا یہ چند شعر اس ضعیفہ نے بنا کسی فکر و تامل کے انہیں دنوں میں موزوں کیے تھے جنکو اس رسالہ میں تحریر کیا گیا۔

ایہا ہمہ را ظہور حــق می بینم
دانستہ یکی جملہ صفت می بینم
نقش فنا بقباحت بے رنگی یار
بے رنگ بتور رنگہا را بشمار

یار آمــد در بغل بے محنت شبہاے ہجر
عاشــق و دیوانہ بودم اشتیاقم داد اجــر

شوق تو مرا در بر، می گیرد و می مالد
ہر لحظہ و ہر لمحہ ایں ذوق تو می بالد

پیر من و خدائے من دین من و پناہ من
نیست کسے بغیر تو، شاہ من و الٰہ من

امروز ندیدم کسے ثانی تو،
مائیم بروز عید قربانی تو

اے شاہ ز یک نظر بکردی کارم
شاباش، چہ خوش نمودی، یارم

خوشا ہجرے کہ باشد آخرش وصل
خوشا فرعے کہ گردد عین آن اصل

تاثیر زبان خاصۂ شاہ من است
تقدیر عیان خاصــۂ ماہ من است

دریاب رہے کوچــۂ آن ملا شاہ
کوہست، خزینہ دار توحید الٰہ

(ترجمہ)

میں ظہور اشیاء کو ظہور حقیقت سمجھتی ہوں وہ اصل حقیقت تو ایک اور واحد ہے اور باقی جو کچھ ہے اسکی الوہی صفات کا پرتو ہے اور بس،-

تو [رنگین پرچھائیوں کی صورت] یار کی قامت بے رنگی پر نقش فنا کی مثال ہے خود [پانی کی طرح] بے رنگ ہوجا اور [دھنک کے سے] ان رنگوں کو مت شمار کر۔

شب بحر کی بے قراریوں کے بغیر میرا محبوب میرے آغوش میں آگیا میں عشق میں دیوانہ ہورہا تھا میرے اس شوق فراواں اور دل بے تاب نے مجھے یہ اجر عطا کیا۔

تیرا شوق مجھے اپنی آغوش میں لیتا ہے اور مجھے چھوڑتا ہے اور اس کے ہر لمحہ اور ہر ثانیہ میں تیرے جذب و شوق کی بے قراریاں بڑھتی جاتی ہیں۔

وہ میرے پیر ہیں، میرے خداوند ہیں اور میری پناہ ہیں اور ان کے ماسوا میرا نہ کوئی شاہ ہے نہ خداوند ہے

آج مجھے کوئی تیرا ثانی نظر نہیں آتا، ہم آج جانورانِ عید قرباں کی طرح سر جھکائے ہوئے تیرے سامنے کھڑے ہیں۔

اے بادشاہ تو نے ایک نظر میں میری دنیا بدل دی تم پر ہزار آفریں کہ تم نے اپنی توجہ خاص کی بدولت مجھے میرے پیر روشن ضمیر کی شکل دکھلادی۔

وہ جدائی کتنی مبارک ہے کہ جس کا انجام وصل ہے اور کیسی مبارک ہے وہ شاخ کہ وہ فرع ہوکر بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین شجر ہو۔

تاثیر زبان میرے حضرت ملا شاہ کی خصوصیت ہے اور تقریر کو تصویر بنا دینا ان کے ماسوا کسکو آتا ہے کہ ان کا پرتو جمال ماہ دو ہفتہ کی طرح

میرے دل کو روشن کیے ہوئے ہے۔

حضرت ملا شاہ کے کوچہ کی راہ تلاش کرو کہ آج وہی تو ہیں جو توحید ذات اور اسرار الٰہیہ کے خزینہ دار ہیں۔

سنہ ایکہزار اکیاون ھجرالنبوی میں ماہ رمضان المبارک کی ۲۷ ویں تاریخ کو اس مختصر رسالہ نے جس کا نام «صاحبیہ» ہے صورت اتمام پائی۔

اگرچہ اس رسالہ کی مولفہ یہ فقیرہ بے بضاعت، اور حقیرۂ بے استطاعت ہے لیکن اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے کہ اس میں حضرت قطب آفاق، ہادی سبیل طریقت و دلیل راہ حقیقت مرشد والا دستگاہ برگزیدۂ بارگاہ اللہ حضرت ملا شاہ کا احوال سعادت آمال ہے [اللہ پاک انکو سلامت باکرامت رکھے] اس لیے کہنا چاہیے کہ اس کا حرف حرف گوھر یکتا ہے اور فقرہ فقرہ بیش قیمت موتیوں کی لڑی ہے جو معرفت الٰہی کے راستے پر چلنے والوں کے سینہ و گردن کو زینت بخشتی ہے۔

میں امیدوار ہوں کہ اہل مطالعہ کو اس رسالہ کے صفحات کی سیر سے فائدہ تمام حاصل ہوگا اور اس ضعیفۂ نحیفہ اور اس فقیرۂ حقیر کو جس نے اپنی عمر بے مقصد ضایع کی ہے اسی طرح نوازا جائیگا۔ اللہ پاک کے سب پیغمبروں، تمام صحابیوں اور جمیع اولیا اللہ نیز میرے مرشد والا نژاد، شیخ الاسلام، سلطان مشایخ، محبوب الٰہی حضرت ملا شاہ کی برکت سے دن بدن و ساعت بہ ساعت میرے دل کا ذوق و شوق اور معرفت حق کے لئے میری لگن بڑھتی رہے گی اور ہمہ وقت اسی خیال و حال میں مستغرق رہونگی [آمین یارب العالمین]

• •

ڈاکٹر کلیم سہسرامی
راج شاہی یونیورسٹی
(بنگلہ دیش)

جمیل عظیم آبادی
حمد و نعت کے آئینے میں

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک سچا مسلمان ہونے کیلئے صرف ایکؑ خدا اور اسکی وحدانیت پر ایمان و یقین کافی نہیں بلکہ سرور کائنات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و سلم کے ساتھ محبت و عقیدت بھی لازمی ہے کیوں کہ اس کے بغیر اسلام کے ایک اہم رکن کی تکمیل نہ ہوسکے گی، اور اس طرح بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت ممکن نہیں یوں بھی محبوب خدا رسول اکرم صلعم کے ساتھ جذبۂ خلوص اور والہانہ عشق کا اظہار ہر مسلمان کیلئے ضروری ہی نہیں بلکہ جزو ایمان کی حیثیت رکھتا ہے اور عام طور پر حصول نجات اور حشر کے دن بخشایش کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی عقیدت و ارادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شعرا نے شعر و سخن کے گل بوٹے کھلائے ہیں چناں چہ حمد و نعت کا اطلاق ایسے کلام پر ہوتا ہے جس میں خدا کی عظمت و پیغمبر اسلامؐ کی ثنا و صفت بیان کی گئی ہو اور ان سے والہانہ محبت اور مخلصانہ عقیدت کا اظہار کیا گیا ہو۔ حمد و نعت کے لئے صنف شعر کی کسی ہئیت کی پابندی نہیں، شاعر اس کا مجاز ہے کہ وہ اپنے جذبات و کیفیات کو اصناف سخن کے جس قالب میں بھی چاہے سمودے، یہاں تک کے دور حاضر میں نظم معرا اور نظم آزاد میں بھی نعت کہی گئی ہے۔

سرور کائنات صلعم کی شخصیت اتنی مقدس اور متبرک ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے : "وما أرسلنٰک إلا رحمة للعٰلمین یعنی میں نے آپکو دونوں عالم کے لئے رحمت بناکر بھیجا ہے، دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے إنك لعلیٰ خلقٍ عظیم یعنی آپ کی اخلاقی عظمت سب سے بلند و برتر

ہے۔ اردو میں نعت گوئی کی روایت فارسی سے اور فارسی میں عربی سے آئی، جب آپ ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ کا استقبال حس انداز میں کیا گیا اس کی مثال یہ عربی اشعار ہیں ؎

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجبت شکر علینا ما دعا للہ داع

یعنی وداع پہاڑ کی گھاٹیوں سے چودھویں کا چاند نکل آیا، ہم پر خدا شکر واجب ہے، جب تک دعا مانگنے والے مانگیں، حضرت حسّان ابن ثابت انصاری رض کے نعتیہ اشعار اور امام بوصیری کا نعتیہ قصیدہ جو «قصیدہ بُردہ شریف» کے نام سے مشہور ہے، دور صحابہ میں فرزدق اور عہد عباسی میں متنبی کے قصیدے نعت گوئی کی روایت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں

جب عربوں نے ایران فتح کیا تو اسلام کی روشنی نے ایرانیوں کے ذہن و قلب کو بھی منور کیا اور عربی زبان و ادب نے فارسی شاعری کو بھی متاثر کیا۔ ایرانی شاعروں نے نعت گوئی کی روایت کو اپنے سینوں سے لگایا اور پیغمبر اسلام کے ساتھ اپنے والہانہ جذبات کا اظہار جس حُسن عقیدت اور حسن خلوص کے ساتھ کیا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ایرانی شاعروں نے فارسی کے علاوہ عربی زبان میں بھی نعت کہی جس کی مثال شیخ سعدی اور عبدالرحمٰن جامی کے یہاں ملتی ہے۔ سعدی کے یہ اشعار ان کے مخلصانہ خراج تحسین کی پیش کش ہیں ؎

بلغ العلیٰ بہ کمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلّو علیہ و آلہٖ

اسی طرح جامی کے یہ نعتیہ اشعار جن میں جامعیت اور صداقت کی روح بھردی گئی ہے، بے مثال ہیں ؎

یا صاحب الجمال و یا سید البشر من وجھک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر

اب جامی کے چند فارسی اشعار ملاحظہ کیجئے جن کا کیف و سرور وہی محسوس کرسکتا ہے جسے پیغمبر اسلام ؐ کی ذات سے عقیدت و ارادت ہے ؎

نسیما جانب بطحا نظر کن زاحوالم محمد را خبر کن
توئی سلطان عالم یا محمد زروی لطف، سوی من نظر کن
بر این جان مشتاقم درآنجا فدای روضۂ خیر البشر کن

خواجہ فریدالدین عطار کی مثنوی کا یہ نعتیہ شعر ملاحظہ ہو ؎

خواجۂ دنیا و دین ، گنج وفا صدر و بدر هردو عالم مُصطفیٰ

حضرت امیر خسرو سے جو نعت منسوب ہے اس کا صرف مطلع پیش کیا جاتا ہے جس میں سوز و گداز ، وجدانی کیفیت اور سپردگی پائی جاتی ہے ؎

نمید انم چہ منزل بود ، شب جائیکہ من بودم
بہر سو ، رقص بسمل بود ، شب جائیکہ من بودم

اسی طرح شاہ جہاں کے درباری شاعر قدسی مشہدی کی نعت لازوال ہے جس میں آج بھی وہی تازگی اور سحر انگیزی پائی جاتی ہے لیکن تحقیقی دنیا کا یہ انکشاف قاری کیلئے حیرت کا باعث ہوگا کہ یہ نعت قدسی کہ کسی مطبوعہ یا قلمی دیوان میں دستیاب نہیں ، اس نعت کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے ؎

مرحبا سید مکّی مدنی العربی دل و جاں باد فدایت ، چہ عجب خوش لقبی

دیکھئے عرفی شیرازی کسقدر ادب و احترام کے ساتھ کہتا ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن ، مشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن ، کمال بی ادبی است

اور فیضی کی نعت کا یہ شعر کتنی شیفتگی اور دل سوزی سے کہا گیا ہے ؎

یا رسول اللہ ! بسوی خود مرا راہی نما تاز فرقِ خود قلم سازم، زدیدہ پا کنم

مرزا غالب اپنی انانیت اور احساس برتری کے باوجود جب نعت گوئی کی منزل میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں بھی اپنے انفرادی اسلوب سے ایک نقش لازوال ثبت کر

دیتے ہیں، زرا شاعرانہ اور عاجزانہ انداز بیان دیکھئے ؎

حق جلوہ گر، ز طرزِ بیان محمد است آری، کلام حق، بزبانِ محمد است
غالب، ثنای خواجہ، بہ یزدان گزاشتم کان ذاتِ پاک، مرتبہ دانِ محمد است

عصر حاضر کے مفکر شاعر علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است ای خنک شہری کہ آنجا دلبراست

یہ تھے چند نمائندہ نام ان شعرا کے جنھوں نے فارسی زبان میں نعت گوئی کی روایت کو برقرار رکھا اور سرور کائنات کی ذات والا صفات کو اپنے حسن کلام سے خراج عقیدت پیش کیا۔

عربی فارسی کی طرح اردو شاعری کا دامن بھی نعتیہ اشعار سے خالی نہیں اردو میں دکنی عہد سے نعت گوئی کے سراغ کا پتا چلتا ہے، نویں صدی ہجری کے دکنی شاعر فخرالدین نظامی نے اپنی مثنوی « کدم راؤ پدم راؤ » میں نعتیہ اشعار کہے ہیں، اس کے بعد دسویں صدی ہجری میں گجرات کے ایک قدیم شاعر خوب محمد چشتی نے اپنی نعتیہ مثنویوں « خوب ترنگ » اور « امواج خوبی » میں نعتیہ اشعار کا اہتمام کیا ہے، گیارھویں صدی ھجری میں ملا وجہی کی مثنوی « قطب مشتری » میں بھی نعتیہ اشعار پائے جاتے ہیں، اس کے بعد وجہی اور نصرتی کے یہاں مثنویوں میں نعت کے علاوہ معراج کا بیان ملتا ہے، لیکن آگے چل کر معراج کا بیان اور اس کی تفصیل ایک نیا روپ دھار لیتی ہے یعنی اس کی مقبولیت اتنی عام ہوگئی کہ اس نے ایک مستقل صنف کی صورت اختیار کرلی۔ یہاں صرف اس قدر بیان کردینا کافی ہوگا کہ دکن میں مختلف شعرا نے تقریباً نو معراج نامے مستقل تصنیف کی صورت میں مرتب کئے جن سے سرور کائنات صلعم کے ساتھ ان کے احترام و عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ « معراج نامہ » کی پیروی میں « مولود نامے » « وفات نامے » اور « نور نامے » بھی دکنی شعراء نے ترتیب دئیے۔ ان تمام تصانیف کا تعلق بہرطور نعت رسول سے ہے۔

شمالی ھند میں، سودا سے پہلے تلاش و جستجو کرنے سے بلاشبہ کچھ

نعتیہ اشعار مل جائیں گے لیکن مرزا سودا کے یہاں ایک طویل نعتیہ قصیدہ ہماری نظر سے گزرتا ہے۔ اس کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے مختلف شعرا کے یہاں نعتیہ اشعار پائے جاتے ہیں اردو شاعری میں اکثر و بیشتر شعراء نے اپنے دواوین کے آغاز میں حمد کے بعد عموماً نعت کی شمولیت کا التزام کیا ہے، چناں چہ داغ دہلوی اور امیر مینائی کے تلامذہ تک اس روایت پر پابندی سے عمل کیا گیا لیکن جن لوگوں کی نعتیں مشہور و مقبول ہوئیں ان میں خواجہ حالی، محسن کاکوروی، شاہ نیاز احمد بریلوی، شاہ اکبر داناپوری، حفیظ جالندھری، شاہ فضل امام، واقف آروی، کلیم عثمانی، ماہر القادری، ظہور الحمار کی نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں ایسے شعرا کی تعداد کم نہیں جنہوں نے نعتیہ اور میلاد کے مستقل مجموعے مرتب کرکے شائع کئے۔ اس طرح اردو شعرو سخن کا دامن پیغمبر اسلام کی مدح و ثنا اور تعریف و توصیف سے خالی نہیں، اس ضمن میں میر باقر آگاہ کی «راحت جان» امیر مینائی کی «محامد خاتم النبیین» جلیل مانکپوری کی «معراج سخن» غلام امام شہید کی «مولود شہیدی» سعید الکھنوی کی «مولود سعیدی» اور «زیور ایمان» اکبر وارثی میرٹھی کی «میلاد اکبر» طپش گورکھپوری کی «میلاد طپش» آسی غازی پوری کی «عین المعارف» شاد عظیم آبادی کی «ظہور رحمت» نواب عزیز جنگ کی «تصویر نور» فاضل بریلوی کی «حدائق بخشش» زائر حرم حمید صدیقی کی «گلبانگ حرم» اقبال سہیل کی «ارمغان حرم» خواجہ حسن نظامی کی «میلاد نامہ» کیف امروہوی کی «میلاد مقبول» گوہر رام پوری کی «میلاد گوہر» شاہ معین آروی کی «تحفۃ الرسول» رحمان علی طپش جہان گیر نگری کی «گلزار نعت» شوق چاٹگامی کی «فوز الکبیر» عبدالعزیز خالد کی «منحمنا» راغب مراد آبادی کی «حضور خاتم النبیین» عمیق حنفی کی طویل نظم «صلصلۃ الجرس» کا تذکرہ عین مناسب ہوگا ان کے علاوہ گذشتہ چند برسوں میں پاکستان سے محشر رسول نگری، حفیظ تائب، پروفیسر سید اقبال عظیم، اور اور عارف عبدالمتین وغیرہ کے نعتیہ کلام کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی ترقی میں جس طرح برابر کا حصہ اہل ہنود نے لیا ہے اسی طرح نعت گوئی میں بھی ہندو شعرا، مسلمان شعرا سے کسی طرح پیچھے

نہیں ، ایسے شعرا کی فہرست طویل ہے لیکن چند قابل ذکر شعرا کے نام پر اکتفا کرتا ہوں مثلاً لچھمی نراین شفیق ، دیا شنکر نسیم لکھنوی ، تلوک چند محروم ، جوش ملسیانی ، پربھو دیال مصر ، بھگوان داس بھگوان ، آنند نرائن مـلّا ، نریش کمار شاد ، دیا شنکر پرشاد فتنہ آروی ، عرش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد .

مولانا عبدالسلام ندوی نے « شعر الہند » میں اردو نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ متاخرین کے نعتیہ کلام میں حسب ذیل خصوصیات مشترک ہیں :

(۱) رسول کی شان میں عاشقانہ الفاظ مثلاً وصل ، ہجر ، شوق ، اور بیتابی ، وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے اور اس حیثیت سے آپ کے خط و خال ، زلف و گیسو ، لب و دھن ، اور چہرہ و رخسار وغیرہ کی تعریف و توصیف کی ہے .

(۲) معنی سے زیادہ الفاظ پر زور دیا گیا ہے یعنی جدید استعارے پیدا کئے گئے ہیں اور رعایت لفظی اور صنعت تضاد وغیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے .

(۳) بہت سی غیر متحقق روایتیں اور معجزات نظم کئے گئے ہیں .

(۴) شاعرانہ مبالغہ طرازیوں میں صحیح واقعات اور مستند روایات کی صورت بدل گئی ہے .

مذکورہ بالا صفحات میں جن حمد اور نعت کہنے والے شاعروں کے نام اور کلام کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے پس منظر میں جمیل عظیم آبادی صاحب کی حمد و نعت کے مجموعہ « وحدت و مدحت » کا مطالعہ مقصود ہے ، جمیل صاحب اس سے پہلے اپنی غـزلوں کا ایک مجموعہ « دل کی کتاب » اور دوہوں کا مجموعہ « گیان درپن » کے نام سے شایع کرچکے ہیں . « وحدت مدحت » ان کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے اس میں دو حصے ہیں ، پہلے میں حمد دوسـرے میں نعت ، دونوں حصوں میں غـزل ، مثنوی ، مربع ، مخمس ، مسدس ، قطعہ ، رباعی ، نظم آزاد اور نظم معرا میں بھی داد سخن دی گئی ہے اور شاعر نے اپنی جولانی طبع کا کرشمہ مختصر اور طویل دونوں بحـروں میں دکھایا ہے کتاب کا ورق الٹئے تو

حمد کے حصے میں جو پہلی غزل ملتی ہے اس سے شاعر کے ذوق و شوق کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کائنات کے خالق کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہے۔ اسے یقین ہے کہ قدرت کے جلوے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں لیکن وہ ایسے ذوق نظر کے حصول کا متمنی ہے جس کے ذریعہ اس کی رسائی مشیت کے سرا پردۂ حجاب تک ہوسکے۔ اس ضمن میں یہ دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

یہ قمر، یہ شمس، یہ کہکشاں، یہ نسیم صبح، یہ گلستاں
ہیں تراشے حسن ہے یہ آئینے، اسی شیشہ گر کی تلاش ہے
ہے جمیل، ہر سو وہ ہے گماں، مری آنکھ سے ہے مگر نہاں
اسے دیکھ لے جو بے حجاب میں، مجھے اس نظر کی تلاش ہے

شاعر کو خدا کی عظمت و بزرگی کا اعتراف ہی نہیں، عقیدۂ راسخ بھی ہے کہ خدا کی تجلی کا نور، دنیا کی ہر شئے سے نمایاں ہے اور ذرے ذرے میں پنہاں ہے لیکن اس کے لئے بصیرت اور بصارت دونوں کی ضرورت ہے، اس کے بغیر قدرت کے جلوؤں اور مشیت کے کرشموں کو دیکھنا اور سمجھنا ممکن نہیں، شاعرانہ انداز میں ان باتوں کو بیان کرنا اور بات ہے لیکن صحیح طور پر ان کا ادراک و احساس حسے حاصل ہوجائے وہی اپنے جذبات کی سچی عکاسی کرسکتا ہے۔ شاعر کے یہاں اسی کیفیت نے اسے درگاہ خداوندی میں اسے سجدۂ شکرانہ ادا کرنے پر مجبور کیا اور وہ باوضو ہوکر ہر نفس اس کی مدحت سرائی اور تسبیح خوانی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ یہ اشعار مطالعہ فرمائیے اور شاعر کے یہاں ان تمام باتوں کے دوش بہ دوش انداز بیان میں متانت و سلاست اور سادگی و صفائی کا بھی مظاہرہ کرتے چلئے ؎

اے خدای لم یزل، اے خالق کون و مکاں
تیرے جلوؤں سے منور ہے زمین و آسماں
چشم بینا کیلئے تو ہر جگہ ہے ضوفشاں
ذرّے ذرّے سے ہویدا، پتے پتے سے عیاں
ہم ذکر تیرے نام کا صبح و مسا کریں

جی چاہتا ہے سجدے پہ سجدہ کیا کریں
کس طرح شکر ہم ترا مولا ادا کریں
قلب جمیل میں تو ہمیشہ مقیم ہے
اے رب ذوالجلال، تو سب سے عظیم ہے

اسمائے حسنیٰ کا استعمال ملاحظہ فرمائیے ؎

عادل ہے، مستجیب ہے، بے حد حلیم ہے
بندے پر اپنے سب سے زیادہ رحیم ہے
ہر شئی سے آشنا ہے، خبیر و علیم ہے
خالق ہے کائنات کا، رب کریم ہے
اے رب ذوالجلال، تو سب سے عظیم ہے

خشوع و خضوع کی مثال ملاحظہ ہو ؎

میری تسبیح ذات گرامی تری میرا ایمان شانِ دوامی تری
ہے جمیلِ حزیں مدحت سرا تیرا ہر نفس وہ یہی کہتا رہے باوضو
اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

حمد کے حصے میں تینوں نظمیں «مظہر نور خدا» اور «پربت اور رائی» ایک ہی موضوع کی مختلف صورتیں ہیں جن میں شاعر نے مختلف انداز بیان میں اظہار خیال کیا ہے۔ «مظہر نور خدا» کا موضوع یہ ہے کہ شاعر تنہائی میں دنیا اور اس کی تمام چیزوں کے متعلق جب سوچتا ہے تو اسے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ وہ ان چیزوں کی حقیقت جاننا چاہتا ہے، فلسفۂ کائنات کے بارے میں اس کا استعجابیہ انداز بیان سادگی اور صداقت کے ساتھ قاری کو لطف اندوز کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آخری بند میں شاعر اس کا جواب خود ہی یوں دیتا ہے ؎

یقیں کی آنکھ سے جو دیکھا میں نے
گواہی مل گئی ہر شئی سے مجھ کو
یہ سب کچھ «مظہر نور خدا» ہے
وہی ہر چیز میں جلوہ نما ہے

اسی طرح دوسری نظم " نور " میں شاعر نے اس کی تفصیل و تشریح پیش کی ہے کہ دنیا میں نور برداں کس کس روپ میں جلوہ گر ہے اور جب اسے یقین ہوجاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ سراپا ایک نور ہے تو اس امر کا بےمحابا اعلان کردیتا ہے ؎

ابتدا سے انتہا تک لازوال و بے مثال

" پربت اور رائی " تین بند کی مختصر سی نظم ہے جس میں شاعر خدا کی عظمت و بزرگی کے پیش نظر اسے " پربت " اور خود کو " رائی " سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ نظم دوہے کی ہئیت میں کہی گی ہے ، اس میں ہندی اور بھاشا کا امتزاج شاعر کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ ساتھ شیرینی پیدا کردیتا ہے اور یہی اس نظم کی جان ہے۔ مثال کے طور پر ایک بند نقل کیا جاتا ہے ؎

دونوں جگ کا راجہ تو ہے ، تیری ہے جے کار
تو ہی سب کا ان داتا ہے ، تو ہی پالنہار
سورج ، چندا ، جگمگ تارے ، تیرے سب اُپہار
تجھ سے جگمگ من مندر ہے ، جگمگ ہے سنسار
تو پربت ، ہم رائی ، دیالو ، تو پربت ، ہم رائی

جمیل صاحب کو صرف شاعری سے دلچسپی نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے مطالعے سے بھی شغف ہے۔ اس لیئے ان کے بعض اشعار میں قرآنی تلمیحات کی طرف بھی اشارے پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "نحن اقرب من حبل الورید" یعنی ہم تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہیں ، دیکھئے شاعر نے اسے کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ اس شعر کا صوتی آہنگ اور سادگی بھی قابل توجہ ہے ؎

قریب رگ جاں ، مرے پاس تو ہے		مری آس تو ہے ، مری سانس تو ہے

اسی طرح "کن فکاں" کی تلمیح بھی ملاحظہ ہو ؎

لفظ "کن" سے جہاں تو نے پیدا کیا		طور پر تو نے خود کو ہویدا کیا
یہ جہاں رنگ و بو ، کیا چیز ہے تیرے لئے		ایک لفظ کن فکاں ، بس ایک لفظ کن فکاں

لیجئے تاریخی تلمیح کی بھی ایک مثال پیش کی جاتی ہے ؎

انجمن در انجمن ہے جلوہ آرائی تیری
تیری صناعی نمایاں، گلستاں در گلستاں
پیٹ میں مچھلی کے تو نے رزق یونس کو بھی دی
تیری رزاقی کی شہرت، داستاں در داستاں

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حمد کی بہ نسبت نعت کہنا زیادہ مشکل ہے، نعت میں سرور کائنات صلعم کے مراتب و مناصب کا قدم قدم پر خیال رکھنا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے اوصاف حمیدہ کے بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے احتیاط برتنا لازمی ہے، زراسی چوک اور شاعرانہ مبالغہ شاعر کے تمام تر معتقدات اور کلام کو غارت کردیتا ہے، اگر جمیل صاحب کی نعتوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اس کوچے میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے اور شاعرانہ حُسن بیان اور قدرت کلام کے ساتھ ساتھ اعتدال و احترام کو بھی مد نظر رکھا ہے یہی ان کی شاعری کا کمال ہے، پیغمبر اسلام صلعم کے ساتھ جذبۂ عقیدت اور جوش محبت میں ان کی زبان اور ان کے قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلتا جسے آنحضرتؐ کی ذات گرامی کے منافی سمجھا جائے یا اسے مبالغہ آرائی سے تعبیر کیا جائے۔ وہ رسول اکرم صلعم کے احترام و افتخار کے کس قدر قائل ہیں اس کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے ؎

وہ کمال علم و حکمت، وہ جمال کبریا
جس پہ نازاں آدمیت، وہ رسول محترم
کون ہے جلوہ فگن، اس قلب مضطر میں جمیل
جو سراپا نور و رحمت، وہ رسول محترم
جمیل ان کی راہوں کا سچا مسافر
اسے ان کا ہر نقش پا، محترم ہے

نعت کہنا بھی ایک مشغلۂ شعر و سخن ہے لیکن اس عزم و اعتماد کے

ساتھ کہ جب تک تنفس کی آمد و شد کا سلسلہ باقی ہے شاعر اسے نعت گوئی کے محبوب و مبارک مشغلے میں گزار دے، یہ تو اپنے اپنے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔ یہی نہیں بلکہ سرور کائنات پر درود و سلام بھیجنا شاعر کے نزدیک ایک ایسا حسن عمل ہے جسے زہد و عبادت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ شاعر کو خاک پاک مدینہ سے جو قلبی تعلق ہے اس کی بنا پر وہ اس دیار متبرک کو جنت سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا۔ اس کے دل میں دیار پاک کی زیارت کی آرزو اس قدر کشش انگیز ہے کہ وہ جذب و کیف کے عالم ہی میں "گنبد خضرا" کا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا ہے اور یہ کشش، قربت و اضطراب میں کچھ اس طرح تبدیل ہوجانا چاہتی ہے جس سے شاعر کو آں حضرتؐ کے قدموں میں سکون دائمی نصیب ہوسکے۔ یہ تو نصیبوں کی بات ہے اللہ تعالیٰ جسے ایسے مواقع عطا فرمائے! یہاں جو اشعار پیش کئے جاتے ہیں، ان سے شاعر کے مافی الضمیر کی صراحت کے ساتھ ترجمانی ہوتی ہے ؎

جمیل آرزو ہے یہی میرے دل کی ۔۔۔ کہوں نعت جب تک میرے دم میں دم ہے
صبح و مسا، درود محمدؐ پہ بھیجئے ۔۔۔ حسن عمل، یہ زہد و عبادت سے کم نہیں
میری نظر میں کیا ہے مدینہ، نہ پوچھئے ۔۔۔ جنت اگر نہیں ہے تو جنت سے کم نہیں
آرزوئے زیارت ہے، مقصود دل ۔۔۔ جذب میں طیبہ طیبہ پکارا کریں
سبز گنبد نگاہوں میں رقصاں رہے ۔۔۔ بیٹھے بیٹھے یہیں سے نظارا کریں
یہ جمیل حزیں کب سے بے تاب ہے ۔۔۔ تیرے قدموں میں مل جائے اس کو اماں

نعت کے سلسلے میں معراج کا بیان نہ آئے، یہ ناممکن ہے، شعرا نے اپنے اپنے طور پر کبھی صرف اس کی تفصیل پیش کی ہے، اور کبھی اشارے کنائے میں یہ بات کہہ دی ہے جمیل صاحب کے یہاں یہ دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں بلکہ ان کے نزدیک معراج عظمت آدم کا سبب ہے کیوں کہ پیغمبر اسلام صلعم کے طفیل پہلی اور آخری مرتبہ انسان کو یہ شرف بخشا گیا کہ عرش اعظم تک اس کی رسائی ہوسکی ورنہ یہ تو صرف فرشتوں کی جولاں گاہ تھی۔ لیجئے آپ بھی معراج کے ذکر مبارک سے لطف اندوز ہولیجئے۔ شاعر نے کس سیدھے سادے انداز میں

یہ بات بیان کی ہے ؎

کہاں تھی تاب کہ موسیٰ وہ دیکھتے جلوہ
جو صرف چشم محمدصلم پہ بے حجاب ہوا

ظلمت شب میں فروزاں آپ ہیں مظہر تنویر یزداں آپ ہیں
عرش اعظم تک رسائی آپ کی باعث تکریم انساں آپ ہیں

قرآن کریم میں معراج کے متعلق یہ آیت آئی ہے "ما زاغ البصر وما طغیٰ" اس سلسلے میں یہ قرآنی تلمیح ملاحظہ ہو ؎

کہتی ہے ہم سے آیۂ "مازاغ اے جمیل
کیا کبریا نے آپ کو ذوق نظر دیا
عیاں ہے آیۂ ما زاغ کی شرح منور سے
جو گم جلووں میں ہے وہ دیدۂ بینا اسی کا ہے

شاعرانہ نقطۂ نظر سے بھی اگر جمیل صاحب کی نعتوں کا جائزہ لیا جائے تو بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں بلیغ الفاظ کے انتخاب اور دل نشیں تراکیب کے استعمال کا سلیقہ، مترنم اور رواں بحروں کے سانچے میں مفہوم و معنی کا پرو آتا ہے، لفظوں کی سادگی و سلاست اور تکرار سے بھی زبان و بیان میں چاشنی او روانی پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف چند بند پیش کئے جاتے ہیں ؎

بنائے کاخ ایماں، مطلع توحید ربانی کلیم نقطۂ دیں، شارح آیات قرآنی
حلیم و عدل پرور، نیز اوصاف انسانی سحاب رافت و رحمت، ردائے ظل سبحانی

سلام اے صاحب لوح و قلم، محبوب یزدانی
سلام اے حاصل کون و مکاں، معراج انسانی

تو صاحب معراج ہے تو انبیا کا تاج ہے
ہر شی پہ تیرا راج ہے قربان تجھ پر نقد جاں

اے سرور کون و مکاں

تو مجتبیٰ تو مصطفیٰ تو چشمۂ جود و سخا

تو مظہر نور خدا روشن زمیں تا آسماں

اے سرور کون و مکاں

ترجمان خدا ہر تو کبریا شان رحمت تری، انتہا انتہا

خود ہے رب العلیٰ، تیرا مدحت سرا ختم تجھ پہ نبوت کا ہے سلسلہ

اے مراد زماں، اے حبیب خدا

اے رسول خدا، اے شفیع الورا

اس آخری بند کے تیسرے مصرعے میں یہ قرآنی تلمیح ہے۔ إن اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یا ایہا الذین آمنو صلوا علیہ وسلمو تسلیما ہ یعنی بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجو۔ ایسے چند اور قرآنی تلمیحات کی مثالیں ملاحظہ کیجئے ؎

جبریل نے بھی دیکھا اسریٰ کی رات کو

قربت رسول پاک کو کتنی خدا سے ہے

تخلیق کائنات کی عنواں ہیں آپ ہی

تفسیر کن مکاں کی شہہ دوسرا سے ہے

ہے توصیف والشمس روئے منور

تو تفسیر واللیل، زلف رسا ہے

رفعنا لک سے روشن ہے جہاں میں مرتبہ تیرا

درخشاں ہے سر عرش معلیٰ نقش پا تیرا

پہلے شعر میں کلام مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے سُبحٰن الذی أسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام إلی المسجد الاقصا الذی بٰرکنا حولہ لنریہ من آیٰتنا ہ انہ ھو السمیع البصیر ہ دوسرے شعر میں حدیث قدسی لو لاک لما خلقت الافلاک ہ اور کن فیکون قرآن کی آیت کی طرف اشارے ہیں۔ تیسرے شعر میں سورہ والشمس اور سورہ الیل کی تشبیہ و تعبیر پیش کی گئی ہے، تیسرے شعر میں سورۂ انشراح کی اس آیت ورفعنا لک ذکرک کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

مجموعے کے آخر میں ایک رباعی اور چند قطعات کے علاوہ دو مختصر سی

نظمیں بھی ہیں ، پہلی نظم کا عنوان ہے " اندھیرا اُجالا " اسمیں تصویر کے دو رخ پیش کئے گئے ہیں ، " پہلا ایام جاہلیت کا نقشہ " اور دوسرا " ظہور قدسی " کے بعد عالم آب و گل میں اس کا اثر ، نظم اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

عجب تھا ماحول زندگی کا
کہ گھپ اندھیرا محیط ہر سو
تھی لات و عزیٰ کی کبریائی
خدا کے بندے بھٹک رہے تھے
اداس نظروں سے تک رہے تھے
کرن کرن کو ترس رہے تھے

اب تصویر کا دوسرا رخ پیش ہے ، ظہور قدسی کی تاثیر دیکھئے ؎

جو دیکھا قدرت نے مسکرا کر
تو پل کے پل میں سماں یہ بدلا
عرب کے رنگیں افق پہ اک دن
وہ آفتاب منیر اُبھرا
تمام عالم میں نور پھیلا
صنم کدوں کا طلسم ٹوٹا
ہر ایک گوشے سے نور پھوٹا
خدا کی توحید کا عقیدا
چراغ بن کر ہوا ، ہویدا

دوسری نظم کا عنوان ہے " اب سحر ہوگی " اس نظم کے بھی دو پہلو ہیں ، پہلے حصے میں روئے زمین پر جبر و تشدد کا دور دورہ اور سچائی پر تاریکی کا تسلط بیان کیا گیا ہے اور دوسرا پہلو نہایت شاندار ہے جس میں اسلام کی روشنی کائنات کے چپے چپے پر پھیلتی ہوئی دکھائی گئی ہے اس کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

شب گزیدوں کی آخری سحر ہوگی
نور پھوٹا حرا سے اُجالا ہوا

شوق بیدار کی آگ سے شعلہ بنی
عظمت نور کا بول بالا ہوا
شب کی ظلمت گھٹی روشنی ہوگئی
کھل کے پُر نور دل کی کلی ہوگئی
برملا کہہ اٹھے سارے اہل وفا
کیسی پر کیف اب زندگی ہوگئی
گوشے گوشے سے آواز آنے لگی
مرحبا مرحبا اب سحر ہوگئی

دونوں نظموں کا انداز بیان یکساں ہے ، ان میں زبان و بیان کی پاکیزگی و سادگی ، سلاست و شگفتگی اور بے ساختگی و دلکشی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ قدرت کلام اور کفر و الحاد کے مقابلے میں حقیقت و صداقت کی تاثیر و تعبیر اہمیت و مرکزیت رکھتی ہے نعت کے موضوع کا دائرہ اگرچہ محدود ہے لیکن شاعر کے فکر و شعور کی رو نے اس روایتی اسلوب اور ہیئت کے پیمانے میں جو تغیر اور امکانی وسعت کے آثار پیش کئے ہیں وہ مستحسن بھی ہیں اور پسندیدہ بھی۔

یہاں اس امر کی وضاحت بے جا نہیں کہ جمیل صاحب حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوچکے ہیں اس لئے ان کی شاعری میں اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ نبی سے عقیدت و محبت کا احساس و احترام پایا جاتا ہے اور یہی سبب ان کے عقیدے میں پختگی، خیالات میں سنجیدگی اور اشعار میں متانت و لطافت کی کارفرمائی نظر آتی ہے جمیل صاحب کے حمدیہ و نعتیہ کلام کے مجموعے « وحد و مدحت » کی اشاعت باعث مسرت ہے۔ اور مجھے یہ توقع ہے کہ دل دادگان شعر و سخن کے علاوہ شیفتگان مذہب و تصوف بھی اس کا استقبال کریں گے اور بقدر ذوق و شوق اس کے مندرجات سے مستفیض ہوں گے۔

• •

جناب کنول ڈبائیوی
بسمہ اللہ لاج، چھوٹی مسجد
جمالپور - علی گڑھ

• اردو کے غنائیہ ڈرامے : سوانگ یا نوٹنکی

عوامی ڈرامے جسکی جڑیں بقول ڈاکٹر اسمیتھ اور کئی دوسرے محققین کے آریوں سے پیشتر کی ہیں . اور جسکی حدود دراوڑی تہذیب سے جاملتی ہیں. جو آریوں سے پہلے پورے ہندوستان بلکہ انڈونیشیا، برہما، سیام، کمبوڈیا تک پھیلی ہوئی تھی. جنکی تہذیب بقول ڈاکٹر عبد العلیم نامی آریوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھی. حقیقت میں اس ڈرامے کی بنیاد مذہبی رقص اور منظوم مکالمے ہیں. جو دیوتاؤں کے سامنے رقص کے ساتھ ادا کئے جاتے تھے. سنسکرت ڈرامے اور بھرت منی کا نالیہ شاستر بہت کچھ ان قدیم السنہ عوامی ڈراموں سے متاثر ہیں. ملک میں اس وقت سے لیکر آجتک سیکڑوں مدوجزر اور انقلابوں کے باوجود اسکا وجود قائم رہا ہے. مختلف ادوار میں اسکے مختلف نام رہے ہیں. اسکا تفصیل سے ذکر میں اپنی زیر ترتیب کتاب اردو کے ہندوستانی لوک ناٹک روایات اور اسالیب میں کیا ہے. اب یہ عوامی ڈرامہ اور نوٹنکی اور سوانگ کہلاتا ہے. حقیقت میں سوانگ اسکا سب سے پرانا نام ہے. اور اس لفظ کی جڑیں دنیا کی قدیم ترین زبان «انڈو یورپین» تک جاپہنچتی ہیں. اس موضوع پر زیر ترتیب کتاب[1] کا قریب چار سال میں کافی مواد اکٹھا کرنے کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ آج کے نوٹنکی یا سوانگ کے

[1] یہ مضمون اب سے تین سال قبل تحریر کیا تھا اور ایک اخلاقانہ مجاہدہ کے تحت کہ سوائے شاعر کے اسے ہندوستان میں کہیں نہیں شایع کیا جائے، ماہنامہ شاعر کی قید میں پڑا ہوا تھا کئی سال کی مسلسل بیماری کے بعد ایک سال سے اس موضوع پر کتاب ترتیب دے رہا ہوں اور ۶۰۰ صفحات کی دو جلدیں ترتیب دی جاچکی ہیں تیسری جلد جس میں سوانگ سے نوٹنکی تک ہے کے قریب ۲۵۰ صفحات ترتیب دئیے جاچکے ہیں اکتوبر ۸۶ع میں اہلیہ کی وفات کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا لیکن صاحبزادے ڈاکٹر ابن کنول کی مدد سے پھر شروع کیا ہے. (کنول)

تھیٹروں کو دیکھا جائے۔ انکے اداکاروں اور مالکوں سے انٹرویو لیا جائے۔ جو اب بھی شمالی ہندوستان کی اکثریت اور دیہات میں بیحد مقبول ہے۔ اب یہ صنف دو حصوں میں تقسیم ہے۔ کچھ مستقل بڑے تھیٹر ہیں۔ جنکے ساتھ اداکاروں اور اداکاراؤں اور ساز و سامان کا لاؤ لشکر ہوتا ہے۔ اور کچھ ایسی کمپنیاں ہیں جو موسمی یا سیزنل ہوتی ہیں مذہبی رام لیلا، راس لیلا اور نوٹنکی ڈرامے بھی دکھاتی ہیں اور بیاہ شادیوں میں کرایے پر بھی جاتی ہیں۔ اور اپنے مختصر سا سامان جس میں دو ایک پردے چند مردانہ اداکار نقارے اور ہارمونیم وغیرہ ہوتا ہے اور دوسری چیزیں یا توکرایہ پر لے لی جاتیں ہیں یا گاؤں والے خود انتظام کردیتے ہیں۔ بہرحال میں نے اپنی کتاب کو حقیقت سے قریب تر کرنے کیلئے اس بڑھاپے میں نوٹنکی یا ڈرامہ دیکھنے کا اور کمپنی میں جانا ہی مناسب سمجھا۔ یوں تو جس میں جھولا کاندھے پر ڈالکر ہاتھرس، ساسنی جلالی، علیگڑھ، خورجہ، بگراسی، جہانگیرآباد، سہسواں، بدایوں، امروہہ، کانپور، لکھنؤ، متھرا اور بنارس وغیرہ گھوما تو اکثر لوگ میرا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ یہ ان کیلئے غیر ادبی مبتذل موضوع تھا۔ کبھی اسکو کسی پڑھے لکھے مرد نے ادبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا حالانکہ اردو کو عوام تک پہونچانے میں مشاعروں کے علاوہ کوئی اور اس کا مدّ مقابل نہیں ہے

۱۹۶۱ء تک نرموہن تھیٹریکل کمپنی کانپور۔ تلھارام سنگیت کمپنی ہاتھرس، نمبردار تھیٹر کمپنی۔ اور شری کرشن تھیٹریکل زیادہ مشہور اور کانپور کی بڑی کمپنیاں تھیں۔ جن میں تلھارام و نرموہن اور شری کرشن کی کمپنیاں عرصہ ہوا بند ہوگئیں۔ صرف نمبردار کی کمپنی رہ گئی ہے۔ جسے انکا لڑکا چلا رہا ہے۔ جب سے نسواں اداکاراؤں نے ڈراموں میں کام کرنا شروع کیا اور انہیں کامیابی ہوئی تو ان میں سے بیشتر اداکاراؤں نے اپنی اپنی کمپنیاں الگ بنالیں جن میں کچھ عرصے گلاب بائی[1] کی کمپنی چلی لیکن بعد میں یہ فیل ہوگئی اب بیسل پور ضلع پیلی بھیت کی رادھا رانی اور شانتی دیوی مرہلی کی چچلا۔ آگرے کی شیاما اپنی اپنی کمپنیاں چلا رہی ہیں شانتی دیوی کی کمپنی جو بیسل پور کے مشہور اداکار جہانگیر کے ساتھ چل

---

۱ جسے ۱۹۸۵ء میں پدم بھوشن ایوارڈ مل چکا ہے

.........1218 7.1.......
Date....11.12.-81

رہی ہے اسکا نام نیو جہانگیر تھیٹر ہے بریلی کی چنچلا کی کمپنی چنچلا تھیٹریکل کمپنی کے نام سے ہے۔ شیاما آگرہ والے کی کمپنی شیاما تھیٹریکل کمپنی کے نام سے چل رہی ہے۔ اور بھی کئی کمپنیاں ہیں۔ اسلام نگر کی مشہور کمپنی کے مشہور سنگیت استاد اداکار شنکر شمبھو قوال کے والد چنی لعل پچاسا کے مشہور شاگرد شـــرافت چلاتے ہیں۔ اس کا نام انورادھا تھیٹریکل کمپنی ہے۔ یہ بھی ایک اچھی کمپنی ہے۔ اور بیسل پور کے سنگیت ڈرامے کی کمپنی رادھا تھیٹر کے نام سے مشہور ہے جو اس دور کے مشہور اداکارہ رادھا رانی کے نام پر ہے۔ جسے ماسٹر محمد شریف سرخی اور انکی اہلیہ رادھا رانی دونوں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دونوں اردو زبان کی طرح قوس یک جہتی کی یادگار ہیں۔ رادھا رانی سے پیدا لڑکے ہندو اور ماسٹر سرخی کی خاندانی بیوی سے پیدا لڑکے مسلمان ہیں۔ کاش ان سے ہم سبق لیتے میں نے علیگڑھ میں ماسٹر سرخی کی ہندو مسلم اولاد و رادھا رانی اور ماسٹر سرخی کی مسلمان بیوی ان سب میں جو میل محبت اور اتحاد دیکھا وہ اس دور میں شاید ہی کہیں ملے۔ ماسٹر شرافت کی کمپنی کی میں نے کافی شہرت سن تھی۔ لیکن اس کمپنی[1] کو میں نہ پاسکا۔ ۲۰ مئی کو وہ اسلام نگر میں تھی میں کالج میں طالب علموں کے امتحانات کی وجہ سے سرکاری ڈیوٹیوں میں مصروف خدمت تھا۔ ۲۱ مئی کے بعد جب فرصت ہوئی اور میں پہونچا تو وہ کمپنی وہاں سے بھی جاچکی تھی۔ جنوری کے وسط میں جبکہ میں دوسرے تحقیقی مضامین لکھنے میں بیحد مصروف تھا سنا کہ علیگڑھ نمائش میں رادھا رانی تھیٹر آیا ہوا ہے۔ اور نمائش کے میدان میں اسکے ڈیرے تنبو لگ گئے ہیں۔ سوچا کہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور علیگڑھ چلا جائے اب سے قریب چالیس سال قبل کا منظر میری نظر میں گھوم گیا۔ میں اس وقت محکمۂ ٹیوب ویل ضلع بدایوں میں ملازم تھا اور ٹیوب ویل آپریٹری کے کام پر موضع سکھانوں ضلع بدایوں میں تعینات تھا اور وہیں ایک گھر میں اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا تھا سنا کہ نوٹنکی آئی ہوئی ہے آٹھ دس آدمیوں کا قافلہ کرایے کی بیل گاڑی میں سوار وارد ہوا۔ اسوقت

---

۱ مورخہ ۱۴ فروری ۸۷ کو علی گڑھ نمائش میں ماسٹر شـــرافت سے ملاقات ہوگئی ۔۔ (نکول)

راستے خام تھے۔ جب میں وہاں پہونچا تو دیکھا کہ ان کے ساتھ دو تین مقارے ایک ہارمنیم ایک ڈھولک اور کپڑونکا ایک چھوٹا سا صندوق ہے۔ یہ انکی سب کائنات تھی معلوم ہوا کہ اترولی ضلع علیگڑھ کے حمید کی پارٹی ہے۔ اور رات کو تمہارے مکان کے سامنے والے چوک میں تماشا ہوگا۔ واضح رہے کے میں ایک پڑھے لکھے وکیل کے گھر میں پیدا ہوا۔ لیکن بچپن میں ہی والــد صاحب کی موت کی وجہ سے ننہال قصبہ بھجوئی ضلع مراد آباد میں رہنے کا موقع زیادہ رہا۔ وہاں میرے ماموں سید عبد الشکور مرحوم سوانگ کی کتابیں پڑھنے اور گانے کے بیحد شوقین تھے۔ اسوقت بھی میرے ذہن میں انکے گانوں کی آواز گونج رہی ہیں۔ میری ننہال ایک اوســط درجے کے کسان خاندان سے متعلق تھی۔ اس قصبے میں زیادہ تر ڈھولا۔ آلہ۔ ہیرا رانجھا سوانگ اکثر ہوتے رہتے تھے۔ بچپن سے ہی میں انکے دیکھنے کا بیحد شوقین تھا۔ اسوقت نوٹنکی میں دوسرے کھیلوں کی بہ نسبت پھول سنگھ پنجابی کا بھی کھیل زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ یوں تو ان ڈراموں کو سوانگ۔ بھگت۔ خیال۔ سورٹھ۔ راس۔ لیلا اور بھجن کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن نوٹنکی ڈرامے کی مقبولیت کی بنا پر قریب ۱۹۲۰ع سے اسے نوٹنکی کہا جاتا ہے اسکے پیچھے بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے۔ اســلامی دور میں سنسکرت ڈراموں کے زوال کے بعد شمالی ہندوستان میں بھگتی تحــریک کی وجہ سے یہ ڈرامہ حکمراں طبقے سے غیر متعلق محکوم عوام میں مقبول رہا۔ یہ منظوم ڈرامہ راگ راگنیوں سے آراستہ ہوتا تھا۔ اس ڈرامے کو کچھ پیشہ ور ٹولیاں جیسے بھگت شب بار داس۔ راس دھاری سوانگیہ وغیرہ کرتے تھے۔ اور دوســرے خیال کے اکھاڑے جس میں استاد اور خلیفہ چنے جاتے تھے۔ اس ڈرامے کو تیار کرتے اور تعلیم دیتے تھے۔ یہ پارٹی دو حصوں میں منقسم تھی جسکی وجہ ایک ہندو سادھو تمن گیر اور ایک مسلمان فقیر شاہ علی تھے جنھیں راجہ چندیری نے انعام کے طور پر ایک کو اپنے تاج کا طرہ اور دوسرے کو کلغی دیدی تھی۔ اس سے یہ اکھاڑے طرہ اور کلغی کہلاتے تھے۔ طــرّہ ہندو فقیر تمن گیر کو اور کلغی مسلمان شاہ علی کو دیا گیا تھا۔ دونوں اکھاڑونمیں خیال اور ڈراموں کے مقابلے ہوتے تھے۔ اور ہر ایک ایک دوسرے کو شکست دینے کا کوشاں رہتا تھا۔ دونوں اکھاڑوں میں پسند

مسلم دونوں فرقوں کے لوگ رہتے تھے۔ میرے آبائی وطن ڈبائی میں طرّہ اکھاڑے کے استاد مسلمان رہے ہیں۔ آج بھی پہلوان نواب کے لڑکے امراؤ خاں عادل وارثی اکھاڑے کے استاد ہیں۔ واضح رہے کہ ان اکھاڑوں میں ڈراموں کے علاوہ فن کشتی، فن رزم بنیتی، اور بنّوٹ وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ ویسے تو شمالی ہندوستان میں منظوم ڈراموں کی ابتدا دسویں صدی سے ہوتی ہے۔ اور اسکے مختلف ادوار میں مقامی زبانوں میں یہ کھیلا جاتا رہا ہے۔ عالمگیر کے زمانے کے شیواجی کے سوتیلے بھائی راماراؤ کے بیٹے کے لکھے ہوئے منظوم اپیرے تنجور کے مدر کے کتب خانے میں تاڑ کے پتّوں پر لکھے ہوئے ملے ہیں۔ جنکے نام شبیہ الدین اور علا الدین ہیں۔ اور جو زبان اور سنگیت میں موجودہ نوٹنکی ڈراموں سے قریب تر ہیں۔ شاید یہ صنف ڈرامہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن پہونچے اور سپاہیوں کی دلچسپی کیلئے کھیلی جاتی تھی۔ اور بعد میں یہ صنف ڈرامہ تماشے کہلائے اور آج بھی یہ سوانگ جنھیں تماشا کہا جاتا ہے مہاراشٹر میں بے حد مقبول ہیں۔ خیال کہلانے والے منظوم ڈرامے ہاتھرس، برج، آگرہ اور راجستھان میں اب بھی مشہور ہیں۔ جب یہ وسط ہند میں پہونچے تو انہیں ماچ کہا گیا اور سنگیت ناٹک کے خیالوں میں جو اب نوٹنکی کہلاتا ہے۔ اور ماچ میں کافی مشابہت ہے۔ اور آج بھی انکی کتابوں پر ماچ کو خیال بھی لکھا جاتا ہے۔ فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں نواز شاعر نے سنسکرت کے شکنتلا ڈرامے کو دوہوں، چھندوں، سویوں، سورٹھوں اور کبت میں ترجمہ کیا تھا یہ پہلا سوانگ تھا دوہوں، چھندوں اور چوبولوں کے سوانگ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں عوام میں کافی مقبول رہے۔ کیونکہ اورنگ زیب کی موت کے بعد ملک میں سیاسی طور پر زبردست انتشار تھا مرہٹوں کے حملوں اور ڈاکوؤں اور لٹیروں کے حملوں سے کوئی دیہات محفوظ نہ تھا۔ گاؤں والوں کو رات دن پہرہ دینا پڑتا تھا۔ رات کو جاگنے کیلئے دوہوں اور چھندوں سے بنے ہوئے منظوم ڈرامے بے حد کام دیتے تھے۔ اور پھر ان سے انکے مذہبی عقائد اور لگاؤ کو بھی بڑھاوا ملتا تھا۔ اور رات بھی جاگ کر گزاری جاتی تھی۔ انگریزوں کا وقار قائم ہونے کے بعد ملک میں کافی حد تک امن و امان ہوگیا تھا۔ اور اودھ کی حکومت کی عیش و آرام کی زندگی میں اس صنف کو اور بھی بڑھاوا

ملا. اس زمانے میں مشرقی پنجاب سے اودھ تک یہ ڈرامے عام تھے. شمالی یوپی اور مشرقی پنجاب میں اللہ بخش اور منسی لعل کے سوانگ مشہور تھے. اور برج بھاشا اور اودھی علاقے میں لچھمن چین کوی، من سکھ رائے، بشن برہمن لعل، اندرمن، کشن لعل، لالہ فقیہ چند ملد شہری، محمد خان اور کوڑے مل کے سوانگ پسند کئے جاتے تھے. من سکھ رائے، چین کوی اور بشن برہمن لعل امروہہ اور بجنور کے دارا نگر گنج کے تھے. اس زمانے میں یعنی ۱۷۷۴ع سے ۱۸۰۱ع تک اودھ کے نوابین کا قبضہ اس علاقہ پر تھا. ان لوگوں کے سوانگ عوام میں بے حد مقبول تھے. ابتک بشن برہمن لعل کا یہ شعر امروہہ اور آگرے میں مشہور ہے. «امروہے کا لال کرواں چوراسی کا سال + نیا سوانگ پر کٹ کیا بشن برہمن لعل» چوراسی سمت ۱۸۸۲ع لغایت ۱۸۲۷ع اور اس سے پہلے کا قلمی مخطوطہ دارا نگر گنج کے من سکھ رائے کا میرے کتب خانے میں موجود ہے. اس سے پہلے امروہے میں سوانگ سپڑے کا کھیل بھی بے حد مقبول تھا. یہ چیزیں نوابین اپنے ساتھ لکھنؤ لیگئے بقول مصنف سیرالمتاخرین ص ۱۴۳ بھگت بھگتیوں سوانگ تماشے کا زور نواب شجاع الدولہ سے شروع ہوا اور آصف الدولہ[1] کے دور میں بے حد عروج پر تھا. نواب کو انکی صحبت میں کافی شغف ملتا تھا. یہ دور آصف الدولہ کے بعد ختم نہیں ہوا. اسی دور سے متاثر ہوکر مرزا سودا نے کہا تھا آج وہ دن ہے کہ جس گھر میں دیکھئے اس میں + کہیں ہوتی ہے بھگت اور کہیں اولک.

ڈاکٹر عطیہ نشاط اپنی تصنیف اردو ڈرامہ اور روایت اور تجربہ ص ۴۴ پر

---

۱ نواب آصف الدولہ نے ایک بھگتیئے مہرا کو خوش ہوکر انعام کے علاوہ راجہ مہرا کا خطاب عطا کیا تھا آصف الدولہ کے مرنے کے بعد بھگت کے استاد نے چوبولے میں انکی تاریخ وفات کہی تھی ـــہ

ایک سہس اٹھا سو چون (۱۸۵۴) سمبت کا پرمان
بارہ سو بارہ (۱۲۱۲) ہجری جانت سکل جہان
کسوار ماس پر سوا سدی جمعرات مدھیان
اٹھائیس ربیع الاول کو آصف تجو پران

تاریخ اودھ جلد سوم از عبدالغنی ص ۲۵۵

بھی اودھ میں موجودہ نوٹنکی کی اس دور کی مقبولیت کے بارے میں لکھتی ہیں روساء اور نوابین سے لیکر نیچے طبقے تک کے لوگ اس میں بے حد دلچسپی لیتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ واجد علی شاہ کار مہیس انہیں سوانگوں اور مذہبی راسوں کی ترقی یافتہ شکل تھی جسے مداری لال اور سید آغا حسن امانت لکھنوی نے زیادہ ترقی دی۔ امانت نے اندر سبھا کو رہیس سے بھی کہا ہے۔ اندر سبھا کے نئے طرز کے رہیس یا سوانگ کے بعد شمالی ہندوستان میں اس سوانگ نے ایک نئی کروٹ لی۔ لوگ انگریزوں کے تسلط کے بعد رؤسا سے لیکر غریب تک اس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ ڈبائی ضلع بلند شہر میں بیبنظیر اور بدر منیر کا سوانگ کھیلنے کیلئے نواب دان پور کا سامان آیا تھا۔ وہاں ڈرامے کیلئے مسٹر ایف ایس گروس کلکٹر ضلع کا ۱۸۸۰ء میں سوایا ہوا ایک پختہ وسیع اسٹیج جو آجکل تالاب کہلاتا ہے آجتک موجود ہے۔ تالاب کے چاروں جانب پچپن پچپن تیس تیس سیڑھیاں اٹلی اور اسپین کے کھلے اسٹیجوں کی یاد دلاتی ہیں۔ دیوبند میں سوانگ اور پرماوت سوانگ کھیلنے کیلئے عوام اور خواص نے ایک کنواں اور ایک مندر بنوایا تھا ہاتھرس ضلع علی گڑھ میں استاد پنسا بنوایا ہوا اسٹیج آج گذشتہ دنوں یاد دلاتا ہے۔ جو اتک دیوبند میں سورٹ کے کوئیں اور پدماوت کے مندر کے نام سے مشہور ہے۔ بہر حال لکھنؤ ہی میں نہیں دہلی میں بھی اس سوانگ کو جو بھگت کے نام سے مشہور تھا جسکا تذکرہ ابو الفضل نے آئین اکبری میں بھی کیا ہے اور ملا عیمت نے مثنوی نیرنگ عشق میں بھی بھگت کے سوانگوں نے محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں بہت اہمیت حاصل کرلی تھی ہندوستانی معاشـــرت مصنف ڈاکٹر محمد عمر ص ۵ پر لکھتے ہیں دہلی کے مشہور بھگت باروں میں تقی نامی شخص کا شمار بہترین اداکاروں میں ہوتا تھا۔ اور وہ محمد شاہ کا منظور نظر بھی تھا۔ بڑے بڑے امراء اسے اپنے مکان پر مدعو کرتے تھے اور بڑے شوق سے اسکی پارٹی کی اداکاری اور سوانگ دیکھتے تھے۔ قاسم نے دہلی کے شہر میں دہلی کے بھگت بازوں کی تعریف کی «بسہ انداز بھگت بازدان دہلی + بھگت کا سوانگ لایا کوپکی بھی، + + اس شعر سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جاسکتا

ہے کہ اسی طرح سوانگ بھگت کہا جاتا تھا۔ جیسے آجکل سوانگ کو نوٹنکی کہا جاتا ہے آگرے میں سوانگ کو بھگت اور راجستھان میں سوانگ کو خیال کہا جاتا ہے۔ اور اس طرح لفظ شب بازی بھی سوانگ کے معنوں میں مستعمل تھا۔ اور فارسی میں شب بازی سوانگ اور کٹھ پتلی کے تماشے کیلئے بولا جاتا ہے جیسے «روز روشن وقت صورت بازی آئینہ است + پست غیبی در پنر آنرا که شب بازی کند» ص ۳٦ فٹ نوٹ سفرنامہ آنند رام مخلص۔ ڈاکٹر محمد عمر کہتے ہیں کہ شب بازی عوام کے تفریح طبع کا بہت مروج ذریعہ تھا۔ اٹاوہ اور دہلی کے شب باز اپنے فن میں مشہور اور معروف تھے۔ اپنے سفر کے دوران محمد شاہ کا گزر اٹاوہ کے شہر کے قریب ہوا تو وہاں کے شب باز بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے کرتب دکھائے۔ بطور انعام بادشاہ نے پانچ روپئے دئیے۔ ص ۲٦ سفرنامہ آنند رام مخلص بہ حوالہ «ہندوستانی معاشرت» ان حوالہ جات سے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں منظوم ڈرامے اور سوانگ کی اہمیت درباروں تک پہونچ چکی تھی۔ اور اسی سے متاثر ہوکر واجد علی شاہ کا رہس اور امانت اور مداری لعل کی اندر سبھا وجود میں آئیں اور ان کے اثر سے اس قدیم سوانگ کی شکل ہی تبدیل ہوگئی پہلے یہ صنف کلاسیکل راگ راگنیوں، دوہوں، چوبولوں تک ہی محدود تھی۔ لیکن جب اس میں سوال و جواب کیلئے غزلیں، قوالیاں، مختلف اشعار، مسدس، مثنوی وغیرہ بھی شامل ہوگئے تو اسکی شکل ہی بدل گئی۔ اس ترقی یافتہ شکل کو رواج دینے کا سہرہ ضلع بلند شہر کے قصبے جہانگیر آباد کے سر ہے۔ جہاں کے مرزا شیفتہ اردو کے تابندہ ستاروں میں سے ایک ہیں۔ جس سرزمین نے حالی کی علمیت کو عروج عطا فرمایا وہیں کے ایک ہندی شاعر استاد اندرمن تھے جنکی موت ۱۸٦۸ ع میں ہوئی۔ جنہوں نے دوہوں اور چھندوںمیں سیکڑوں سوانگ لکھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں علم کی دیوی سرسوتی کی سدھی ہوگئی تھی یہ بہت پاکباز اور بھگت انسان تھے۔ اشعار کہتے جاتے تھے اور انکے شاگرد انہیں لکھتے جاتے تھے۔ اور بعد میں زبانی ہی یاد کرلیتے تھے۔ گنیش لعل، چرنجی لعل، مرلی دھر، بلونتا رام گوبند رام اور پرشادی لعل کے علاوہ بھی بہت سے لوگ انکے شاگرد تھے۔ انکے

لکھائے ہوئے سوانگوں میں قدامت پسندی زیادہ نمایاں ہے۔ جیسی کے میں نے انکے چھ غیر مطبوعہ پرانے سوانگوں میں دیکھی۔ لیکن انکے مرنے کے بعد ان کے شاگردوں نے وقت کے ساتھ ساتھ ان سوانگوں میں تبدیلیاں کیں۔ لیکن اس زمانے میں اکھاڑے بازیاں تھیں۔ آنجہانی استاد اندرمن طرّہ اکھاڑے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں خان صاحب حامد خاں افزا یا محمد خاں خاص ہیں۔ کیونکہ انکی ایک کتاب کے پہلے ایڈیشن میں محمد خاں افزا اور دوسرے ایڈیشن میں حامد خاں چھپا ہوا ہے۔ آپ نے سوانگ «لالہ رخ گل فام» لکھا ہے جسکی ایک کاپی میرے پاس ہے یہ ۱۸۶۰ع اور ۱۸۶۵ع کے درمیان کی تصنیف ہے کیونکہ اسکا مقابلہ اندرمن کی زندگی میں ہوا تھا جن کی موت ۱۸۶۸ع میں ہوئی تھی کیونکہ ۱۸۷۰ع میں یہ حج کو گئے اور انہوں نے بقول انکے پوتے اقبال محمد فیاض کے سوانگ کے کامیاب اور مقبول ہونے کی دعا مانگی تھی۔ ان کا انتقال ۱۸۸۰ع و ۱۸۸۲ع کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ یہ حورجہ ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ انکے شاگرد منشی باقر خاں موزوں نے اس سوانگ کو یعنی (لالہ رخ گل فام) انکے مرنے کے بعد اس میں کچھ غزلیں بڑھاکر چھپوایا۔ یہ سوانگ اس دور میں بیحد مقبول تھا۔ استاد اندرمن کے اکھاڑے کے دوسرے ساتھی ٹھکر چند[1] بلند شہر کے تھے۔ جنھوں نے اسی دور میں سوانگ اندر سبھا گل بکاؤلی لکھے تھے جو انکے لڑکے ہرپرشاد نے ۱۸۸۴ع میں اپنے پریس میں چھاپے یہ سوانگ اب نایاب ہیں۔ اس دور کے کلغی اکھاڑے کے استاد کشن چند جو جہانگیر آباد کے قریب کے موضع کھالور کے رہنے والے تھے۔ یہ اردو فارسی کے کافی جانکار تھے انہوں نے بھی کئی سوانگ لکھے جو ان کے ایک عزیز کے پاس ہیں انکے اکھاڑے میں ریاست پنڈراول ضلع بلند شہر کے کوڑا مل تھے۔ ان دو پارٹیوں میں برسوں مقابلے ہوئے ہیں میں یہ ساری تمہید اسلئے کر رہا ہوں کہ آج استاد اندرمن کے اکھاڑے کے شاگرد پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بیشتر ڈراموں کی تصنیفات استاد اندرمن اور انکے شاگردوں کی دین ہے۔ حقیقت میں نوٹنکی کے اندرمن اسکول کی بنیاد ان کے شاگردوں نے ڈالی اور انہوں نے

---

۱ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے انکے سوانگ کا تذکرہ ہندوستانی تھیٹر میں کیا ہے۔

اندرمن اسکول کو زندہ جاوید بنادیا۔ اندرمن قوم کے چھیپی تھے یعنی لحاف چھاپنے والی پیشہ ور قوم کے تھے۔ واضح رہے کہ جہانگیر آباد کے چھپے لحاف کافی مشہور ہوتے ہیں۔ اور یہاں چھیپیوں کی قوم کے کافی گھرانے ہیں۔ استاد اندرمن کے شاگرد جیسا کے میں پہلے لکھ چکا ہوں طوطا رام، چرنجی لعل، گنیش لعل، گووند چمن، پرشادی، رحمت اللہ اور محمد وغیرہ نے جہانگیر آباد رہکر اکھاڑے میں کام کیا۔ جن میں طوطا رام، چرنجی لعل، مرلی دھر، گووند چمن بھی قوم کے چھیپی تھے۔ اداکاری کے ساتھ شاعری کا مادہ یا شوق کافی رکھتے تھے۔ انہوں نے اندرمن اکھاڑے کے لکھے سوانگوں میں وقت کے مطابق ترمیمیں کیں کیونکہ یہ سب لوگ ہاتھرس ضلع علیگڑھ کے رہنے والے تھے انہوں نے ہاتھرس میں اندر اکھاڑے کے نام سے اکھاڑہ قائم کیا۔ اور بھادوں کے میلے کے موقع پر (یہ میلہ آٹھ دن چلتا ہے) سوانگ دکھائے جاتے ہیں۔ یہ ذکر ۱۸۹۱ع کا ہے۔ ان سے متاثر ہوکر ہاتھرس کے مسٹر مالدیو جی عالم جو ڈپٹی انسپکٹر رہ چکے تھے نے اپنا اکھاڑہ قائم کیا۔ دونوں کے مقابلے ہونے لگے۔ اندرمن کے سوانگ علیگڑھ کے ماسٹر مہاچند جنکی کتابوں کی دوکان تھی کے یہاں شائع ہونے شروع ہوئے۔ اور بے حد مقبول ہوئے۔ اسی دوران میں نتھارام جو راجستھان کے رہنے والے تھے اور ان کے والد ہاتھرس کے قریب گاؤں دریاپور میں آبسے تھے۔ یہ ایک برہمن کے لڑکے تھے۔ خوبصورت بھی تھے۔ اور مترنم نیز بلند آواز کے مالک تھے ان اکھاڑے کے استاد[1] چرنجی لعل اور خلیفہ گووند رام نے نتھا رام کو پسند کیا اور اپنے اکھاڑے میں شامل کرلیا اسوقت ٹکٹ یا پیسوں سے سوانگ نہیں ہوا کرتے تھے۔ بجائے اسکے گاؤں والے انکے تمام انتظامات کیا کرتے تھے۔ اور انعامات ہی انکی محنت کا صلہ ہوتے تھے ان اکھاڑوں میں ایک کھیل کا مہینوں

---

۱ اندر اکھاڑہ ہاتھرس اندر اکھاڑے کی مانند

ہیں استاد گنیش چرنجی اور خلیفہ گووند

جیوا رام داس رسادی سیوک شری پت پدار بند

سدن جانکی ہیرا پلا ظاہر پچھم آئر ہند

نتھارام دج شرما گت بھیروں کالی پتھوار یکے ص ۱۴۸ [illegible] اردو

«سیاہ پوش» لکھا تو کئی سال ڈراموں کے سخت اردو فارسی الفاظوں کے تلفظ ادا کرنے کی مشق کرائی تھی. کچھ عرصے بعد مرلی دھـــر جو ماسٹر باسم کے شاگـــرد بتائے جاتے ہیں گووند چمن، طوطا رام، چرنجی لعل کی مخالفت میں سوانگ لکھنے لگے. پنجاب کے سوانگوں میں زیادہ تر ہریـانوی زبان میں ہوتے ہیں. یوپی کے سوانگوں سے زبان کے علاوہ انکی طرز اور بندش میں بھی جدا ہوتی ہے ان میں پرانا پن ہوتا ہے غزل، قوالی، شعر وغیرہ کا استعمال نہیں ہوتا. اور انکے سوانگ چھندوں میں ہوتے ہیں. یہ صرف میرٹھ، مظفر نگر، پریسانہ، اور پنجاب کے کچھ ہی اضلاع میں پسند کئے جاتے ہیں. بہرحال اسوقت پنجابی سوانگوں میں پنجاب کی لوک کتھا کی بنیاد پر سوانگ نوٹنکی جس میں بھاوج کے طعنہ پر پھول سنگھ پنجابی کے نوٹنکی شہزادی لانے کا ذکر ہے. زیادہ مقبول تھا تو استاد مـرلی دھـر نے ۱۸۸۲ء میں ایک نوٹنکی سوانگ بنایا جو چرنجی لعل کے اندر اکھـاڑے کے نوٹنکی سوانگ سے زیادہ پسند کیا گیا. چرنجی لعل نے نتھارام کو ۱۹۱۰ء کے قریب گود لے لیا تھا. چرنجی لعل نتھارام کے نام سے ایک بک ڈپو بھی قائم کی. ۱۹۱۶ء تک چرنجی لعل اور گووند رام نیز طوطا رام سبکا انتقال ہوگیا. نتھارام بک ڈپو اور تھیٹر کمپنی سب کے تنہا مالک بن گئے. انکے مرنے کے بعد نتھارام نے تجارتی روش اختیار کرلی. نتھارام نے پرانے استادوں کے مرنے کے بعد کچھ دنوں تک تو محمد نے سانگ لکھے اسکے بعد نتھـارام روپ رام سلیم پوری کو جو ایک مدرس تھے اور اچھے شاعر تھے ملازم رکھ لیا روپ رام نے نتھارام کمپنی کیلئے بہت سے سوانگ لکھے جن کی تعداد ستر اسی کے قریب پہونچتی ہے. میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بھادوں کے میلے پر ہاتھرس میں سوانگ پارٹیوں میں زبردست مقابلے ہوا کرتے تھے ۱۹۲۰ء کے قریب ماہو رحمت اللہ کی پارٹی سے مقابلہ ہوا. قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ کی پارٹی کا مضطر صاحب کا لکھا ہوا سوانگ «نوٹنکی شہزادی یا نقلی مالن» بہت کامیاب رہا اسکی کامیابی دیکھکر اسے نتھارام پارٹی نے مضطر صاحب سے اسے خـــرید لیا. اور اسپر مشق کرکے یہ سوانگ جگہ جگہ دکھایا شمالی ہندوستان میں اسے بہت پسند کیا گیا. جس سے انہیں اور پـارٹی کو بہت شہرت ملی پھر چنی لعل پچاسا کی پارٹی نگلے قریبے یہ اتنا مقبول ہوا کہ جہاں کہیں یہ پارٹی جاتی فرمائشوں کے ڈھیر

اسی کھیل کو دکھانے کیلئے ہونے لگتے۔ پھر اس ڈرامے کی مقبولیت کے تحت یہ منظوم صنف ڈرامہ ہی نوٹنکی کہلانے لگی۔ بعد میں کانپور میں جب شری کرشن کھتری اور نرموہن نے تھیٹر قائم کئے اور دوسرے منظوم نوٹنکی ڈرامے تحریر کرائے لیکن مضطر کی تخلیق شدہ نوٹنکی ڈرامے کے سامنے اور کوئی دوسرا نوٹنکی ڈرامہ نہ جم سکا اور نہ ہی ایسی مقبولیت پاسکا۔ مجھے ابتک بچپن میں دیکھے ہوئے اس نوٹنکی کے اشعار زبانی یاد ہیں۔ جنہیں میں اپنے ایک مضمون میں تحریر کرچکا[1] ہوں اور اب یہاں ان نوٹنکی ڈراموں کا تقابلی مقابلہ پیش کرونگا۔

اس عوامی غنائیہ ڈرامہ کے بارے میں ایک بات یہ عرض کرچکا ہوں کہ اندر سبھا کی تخلیق تک یہ ڈرامے برج بھاشا میں لکھے جاتے رہے ہیں[2] یا زیادہ برج بھاشا آمیز ولگر ہندوی میں آج بھی کھڑی بولی ہندی کا کوئی ڈرامہ فلموں کی طرح مقبول نہیں ہوا ان ڈراموں کے لکھنے والوں کی زبان برج بھاشا تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان ڈراموں کی زبان بدلتی اور صاف ہوتی گئی یہانتک کے وہ فصیح اردو میں لکھے جانے لگے۔ یہ اندازہ آپکو قدیم نوٹنکی سوانگوں اور بعد کے نوٹنکی ڈراموں کے موازنے سے ہوجائیگا اور یہ بھی اندازہ ہوجائیگا کہ اردو زبان کی شیرینی اور سلاست زبان کی وجہ سے نوٹنکی ڈرامے بیحد مقبول کئے جانے لگے ان نوٹنکی ڈراموں کو آج بھی دیہاتوں میں خاص طور سے مقبولیت اور پسندیدگی برقرار ہے۔ ان قدیم ڈراموں میں سنسکرت کے ڈراموں کی طرح پہلے منگلا چرن یا حمد خدا ہوتی ہے سوتر دھارا یا رنگا نہیں ہوتا پریانوی سوانگوں کی طرح سوال اور جواب اور راگ راگنیاں ان میں ہوتی ہیں۔ غزلیں، قوالیاں، مسدس، مثنوی، خمسہ اور اشعار بھی نہیں ہوتے۔ لیکن سب سے پہلے

---

۱ زیادہ تفصیل کے لئے زیر ترتیب کتاب «ہندوستانی لوک ناٹک» حصہ سوم کا انتظار کیجئے — کنول

۲ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنی ہندوستانی ڈکشنری کے مقدمہ میں تین قسم کی ہندوستانی ثانی ہے درباری فارسی آمیز ہندوستانی، درمیانہ منشیانہ ہندوستانی اور دیہاتی ولگر ہندوی برج بھاشا اور پراکرت آمیز ہندوستانی
از دیباچہ ہندوستانی ڈکشنری — گلکرسٹ

میرٹھ سہارنپور کے سوانگوں میں انیسویں صدی کے آخر میں سوتر دھار کی ابتداء کھلاڑی سماج اوررنگ آچاریہ کے نام سے شروع ہوئی۔ اور اسکی نقل میں اندرمن اسکول نے بھی رنگا اور کوی کے ناموں سے (سوتر دھار) ڈرامے میں ربـط و تسلسل رکھنے اور سین (منظر) بدلنے کیلئے شروع کیا کیونکہ ان ڈراموں میں یورپین ڈراموں اور سنسکرت ڈراموں کی طرح سین یا ایکٹ نہیں ہوتے اسلئے ایکٹ اور سین بدلنے کا کام رنگا کرتا ہے۔ اب میں اندرمن اسکول کے پرانے نوٹنکی سوانگ سے کچھ اشعار پیش کررہا ہوں اس سے نوٹنکی ڈرامے کی اسوقت کی زبان کا اندازہ ہوجائیگا۔ اسکا مختصر پلاٹ یہ ہے "کہ پنجاب کے سیالکوٹ شہر میں دو بھائی رہتے تھے بڑا بھائی کا نام بھوپ سنگھ اور چھوٹا بھائی کا پھول سنگھ تھا۔ ایک دن پھول سنگھ شکار سے واپس آتا ہے۔ اسنے اپنی بھابھی سے کھانے اور نہانے کیلئے پانی گرم کرنے کو کہا بھابھی نے اسے طعنہ دیا کہ اپنی خدمت کیلئے وہ نوٹنکی شہزادی کو لے آئے۔ طعنہ کی بات اسکے کلیجے کو پار ہوجاتی ہے۔ اور پھر سبکے روکنے کی پرواہ نہ کرکے چھوٹا بھائی نوٹنکی شہزادی کو لینے چل دیتا ہے اور نوٹنکی کے شہر میں پہونچکر شہزادی کے باغ میں مالن کو لالچ دیکر ٹھہر جاتا ہے اور مالن کا ہار جو وہ روز محلوں میں گوندھ کر لیجاتی تھی وہ خود گوندھتا ہے۔ اس ہار کو دیکھکر شہزادی مالن سے ہار گوندھنے والے کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ مالن اپنے بیٹے کی بیوی کا نام لے دیتی ہے۔ شہزادی اسے بلانے کو کہتی ہے اور عورت کے بھیس میں پھول سنگھ محلوں میں پہونچ جاتا ہے۔ دونوں تنہائی میں صادق پیر سے دعا کرتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک مرد ہوجائے اور پھر پھول سنگھ زنانہ بھیس اتار دیتا ہے۔ نوٹنکی اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ محل کے اندر یہ بھید کھل جاتا ہے اور نوٹنکی کا باپ پھول سنگھ کو گرفتار کرالیتا ہے۔ اور پھانسی کے وقت نوٹنکی اسکی محبت میں وہاں آجاتی ہے اور اسکے ساتھ مرنے کو تیار ہوجاتی ہے بادشاہ نوٹنکی کو معاف کردیتا ہے دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ یہ ڈرامہ استاد اندرمن جنکا انتقال ۱۸٦۸ع میں ہوچکا تھا۔ انکی زندگی کا ہے اور اسمیں ترمیم و تنسیخ گنیش لعل اور چرنجی لعل نے کی ہے۔ ڈرامے کا منگلا چرن یا حمد دیکھئے:

دوہا : تنوید پنکج راکھی اُرکروں سوانگ پر ارمبھ
کـــر پاک چھہ مہاریو اس جـان جگـــدمب

چوبولہ : داس جان جگدمب رچوں رچنا گنڑ اگڑ بچاؤ
سب وناش و دوش میری رسنا براج کم جاؤ
چھند پرندھ کروں منڈن دیں امسا ہوجاؤ
اندرمن جن دیں داس کا بیــڑا پـار لگاؤ

دوڑ . شری جگدمبا اُما دمات مت کرو بلما گیان بدھ جین اُوپادیں
داس کنبش چـــرنجی تـو بولنگی ســـوانگ بنـادیں

اس سانگ میں اندرمن کا تخلص ۱۹ بار آیا ہے یہ دوڑ چوبولے کے بعد میں بڑھائی گئی ہے کیونکہ پرانے سوانگوں میں رنگا کے علاوہ دوڑ بھی نہیں ہوتی تھی۔ یہ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی ابتدائی غنائی ترمیم ہے۔ زبان اور ان ترمیموں کی ہی چند باتوں سے نولکی ڈرامے کی قـــدامت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اب آگے نولکی ڈرامے کی چند سطور اور ملاحظہ فرمائیے :

دوہا : صبح ہوت ہی میں چلا کھیلن بین شکار
بعـــد اوٹ کے دوپہر کـو آیا اپنے دوار

چوبولہ : آیا اپنے دوار کہی بھاوج مم تیرے آنو
مت نہ کرے ولمب جلد جل ٹھنڈا مجھے پلا تو
لگ رہی بھاری طلب شتابی حقہ بھر کر لا تو
کیوں کرتی ہے دیر گرم کر جل موئے جلد نہلا تو

دوڑ : وال چھاول کـــر دیجئے ، نہ عــــرصـــہ پل کا کیجئے ،
دیر گر ہوگی تجھکو، تو بھاوج سندری آ غصہ جاوئیگی مجھکو

حمد یا منگلا چرن ، دوہے ، چوبولے کی زبان ٹھیٹھ برج بھاشا ہے۔ اور چونکہ دوڑ بعد میں ملائی گئی ہے اسلئے وہ کھڑی بولی آسان دیہاتی اردو ولگر ہندی

میں ہے اور دونوں کا تفاوت صاف نظر آرہا ہے جو نمایاں شکل میں ہے سوانگ میں قدیم سانگوں کی طرح رنگا یا کوی بھی نہیں ہے اب دوسری نوٹنکی ڈرامے جسکے مالک بھی اب نتھارام ہیں اور جسکا نام نقل مالن عرف نوٹنکی شہزادی ہے میں پچھلے صفحات میں بتا چکا ہوں پہلے سوانگ اکھاڑے بندی سے ہوتے تھے اور سب ملکر ڈرامے کی تخلیق کیا کرتے تھے یا ایک آدھ قدرتی شاعر ہوتا تھا اسکے لکھائے ہوئے ڈرامے ترمیم و تنسیخ کے ساتھ سوانگ کھیلے جاتے رہتے تھے ۱۹۱۰ء تک یہ اکھاڑے فنی اکھاڑے رہے انکا تجارتی لائین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فرمائشی شوق کے طور پر اور یہ اکھاڑے ایک دوسرے اکھاڑے کے مقابلے میں برتری حاصل کرنے کیلئے یہ ڈرامے کھیلے جاتے تھے لیکن پارسی اور دوسری تھیٹر کمپنیوں کی دیکھا دیکھی ان میں بھی تبدیلی آنی شروع ہوئی اور یہ لوگ بھی تجارتی طریقے سے کام چلانے کو سوچنے پر مجبور ہوگئے اور یہ کمپنیاں بھی ڈراما کرنے پیسوں پر جانے لگیں ہاتھرس میں چرنجی لعل نتھارام کے نام سے ۱۹۱۰ء کے بعد بک ڈپو قائم کی گو کتابیں علیگڑھ شہر کے بکسیلر ماسٹر بھاچند کے اور باسو گوکل چند بکسیلر کے یہاں چھپتی تھیں اور وہی ان لوگوں سے ان کے حق تصنیف خرید لیتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ کتابیں ہاتھرس میں چرنجی لعل نتھارام بک ڈپو پر بکنے لگیں۔ ہاتھرس میں استاد ہاسم اور مرلی دھر کی کتابیں دیپ چند بکسیلر کے یہاں بکتی تھیں۔ ۱۹۲۵ء کے بعد ان لوگوں نے اپنے پریس قائم کرائے چرنجی لعل نے جیسا کہ میں پہلے تحریر کرچکا ہوں کہ نتھارام کو گود لیکر اپنا بیٹا بنالیا تھا اسلئے ۱۹۱۶ء میں جب چرنجی لعل انتقال کرگئے تو نتھارام ہی منڈلی اور بک ڈپو کے مالک ہوگئے لیکن ۱۹۳۱ء میں نتھارام کے اکلوتے بیٹے شیام کی موت کے بعد نتھارام نے اپنے ایک عزیز رادھا بلّبھ گوڑ کو گود لیلیا اور وہی اب اس عظیم ادارے کے مالک ہیں چرنجی لعل کی موت کے بعد نتھارام نے سنگیت پارٹی سے اکھاڑے بندی ختم کر کے اسکو تجارتی لائین پر استوار کیا اور اب بڑے بڑے شہروں جیسے کانپور، کراچی، رنگون تک یہ کمپنی جانے لگی۔ اور بابو نظیر کھیسو اور چنی لعل جیسے عظیم اداکاروں نے کمپنی کو عروج پر پہونچا دیا دوسری جانب اسی دریا پور کے رہنے والے عظیم اداکار جو چنی

لعل پچاسا کے نام سے مشہور ہوئے انہوں نے چرنجی لال نتھارام کی پارٹی چھوڑ کر ایک ہی تھیٹریکل کمپنی بنائی اور ہندوستان کے کونے کونے میں اردو اورسنگیت کو پھیلایا آج بھی بیشتر کمپنیوں میں استاد چنی لعل کے شاگرد ہی نظر آتے ہیں کانپور میں سوانگوں کی ابتداء چنی لعل ہی کی ہے آپ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں میں بارائین دھیر بھجوئی قصبہ بھجوئی ضلع مراد آباد اور چھدا گرو ڈھولک بجانے والے انرولی ضلع علیگڑھ کے ان دونوں کے ساتھ کانپور پہونچے اور تین آدمیوں ہی دو اور تین لڑکوں کو لیکر نوٹنکی سوانگ پیش کیا جو بیحد پسند کیا گیا اور استاد چنی لعل کی قدر بڑھی. اناؤ کے رہنے والے پہلوان شری کرشن کھتری جو بازار میں کپڑے کی ٹوپیاں بیچنے کا کام کیا کرتے تھے ادھر انہیں پہلوانی کرنے کا بھی شوق تھا انہیں چنی لعل کا سوانگ بہت پسند آیا اور کانپور میں سب سے پہلے انہوں نے شری کرشن تھیٹریکل کمپنی بنائی جسمیں استاد چنی لعل کو پچاس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھا اسوقت پچاس روپیہ کی بڑی اہمیت تھی سب سے پہلے شری کرشن کھتری نے ہی سوانگ کمپنی میں ملازمت سسٹم شروع کیا نہیں تو اکھاڑے بندی کے زمانے سے ہر اداکار کے حسب مراتب حصے قائم ہوتے تھے نتھارام چرنجی لعل کمپنی میں نظیر گیسو اور نتھارام دو دو حصّوں کے حقدار تھے گیسو باوجو کالا اور لنگڑا ہونے کے اپنی آواز کی بنا پر برج کی کوئیل اور نظیر شہزادہ بینظیر کہلاتے تھے بڑے بڑے مارواڑی سیٹھ اسکی عزت کرتے تھے ایک بار ہوائی جہاز سے نظیر کو رنگوں کے ایک سیٹھ نے بلوایا[1] تھا. کانپور میں قنوج کے رہنے والے ترموہن[2] کرمی بھی استاد چنی لعل کے شاگرد ہوئے تھے اور انہوں نے بھی اپنی ایک کمپنی قائم کی ۱۹۳۰ع کے بعد ترموہن سب سے پہلے فرد تھے جو نسواں اداکاروں کو اسٹیج پر لائے گلاب بائی اسکا نام تھا گلاب بائی انکے اکھاڑے کی

---

۱ مجھے کئی دن ہوئے نصیر احمد جلالی والے نے بتایا جو علی گڑھ میں محلہ بنگلے میں رہتے ہیں کہ ایک بار جلالی میں لیلی مجنوں کا نظیر نے جو مجنوں بنا ہوا تھا گوشت مانگنے پر اپنی ران کا گوشت کاٹ کر دے دیا تھا.(کنول)

۲ واضح رہے کہ یہ لوگ بھی ترموہن اور نتھارام جو بعد کے اندرمن کی چوکھٹ کے شاگرد ہیں. اندرمن کی موت کے بعد جو شاگرد ہو وہ چوکھٹ کے شاگرد کہلاتے ہیں.

سب سے اچھی اداکارہ تھی۔ شری کرشن نے کچھ سال کمپنی چلا کر اپنے بھائی شری رام ملہوترہ کے سپرد کمپنی کردی کیونکہ یہ تجارتی اور اصلی دماغ رکھتے تھے انہوں نے کھتری اور اسلامی بک ڈپو قائم کی اور نوٹنکی کے کانپور اسکول کی بنیاد ڈالی اور ان کی اپنی کمپنی بک ڈپو کیلئے سوانگ لکھوائے ان کے یہاں سوانگ کے ڈرامے یہاں چھپنے اور بکنے لگے۔ انکی قائم کردہ کھتری بکڈپو آج بھی انکے لڑکے چلا رہے ہیں ۱۹۲۰ء کے بعد ہی جب سوانگ کے اکھاڑے پیسہ کمانے کی کمپنیاں بن گئے تو کمپنی کے مالکوں نے اپنے یہاں سوانگ لکھنے پر شاعر ملازم رکھنے شروع کردئیے تھے اور دوسرے شاعروں سے بھی قیمتاً سوانگ اور حق تصنیف لیکر اپنے نام سے شائع کرتے تھے نتھارام کے یہاں روپ رام ویوگی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۰ء تک ملازم رہے۔ اور جیسا کہ گذشتہ سطور میں تحریر کر آیا ہوں کہ انہوں نے کافی سوانگ لکھے ہیں شری کرشن بھی شاعر نہ تھے انہیں دس بیس چوبولے منہ زبانی یاد تھے مگر انکے یہاں کئی شاعر سوانگ لکھنے پر ملازم تھے۔ خود انکے لڑکے کی زبانی معلوم ہوا کہ محمد یاسین، رادھا رمن، لچھمی ناراین، رام دین عرف لبھڑ کاکا، پنّا لعل، چنچل پنڈت، منی لعل مصرا، محمد شریف، کرن جونپوری ملازم تھے آخر میں کرن جونپوری انکے یہاں سوانگ لکھنے پر ملازم رہے۔ اور ترموہن کمپنی میں بھی کئی شاعر سوانگ لکھنے پر انکے یہاں ملازم رہے۔ ان میں خاص محمد یاسین تھے۔ شری کرشن کمپنی چھوڑ کر ترموہن کے یہاں ملازم ہوگئے تھے اور منی لعل بھی ترموہن کے لئے سوانگ لکھتے تھے واضح رہے کہ مالکان پیسہ دیکر سوانگ لکھواتے اور اپنے نام سوانگ میں اکثر ڈلواتے تھے اس لئے کبھی کبھی شاعر اپنا تخلص تک نہیں ڈالتے تھے کیونکہ مالکان اپنی دوکانداری کیلئے خود فرضی شاعر بننا ضروری سمجھتے تھے تاکہ بعد میں شاعر یا اسکے اعزاء کتاب کے متعلق کوئی دعویٰ حق تصنیف نہ کرسکے اور انہیں سستی شہرت بھی ملے اسی لئے نہ تو نتھارام شاعر تھے نہ شری کرشن کھتری اور نہ ترموہن۔ اندر اکھاڑے اور اندرمن اسکول کے لکھے ہوئے سوانگوں کے اصل حقدار نتھارام ہی تھے۔ اور کچھ خریدے ہوئے منظوم ڈراموں پر شاعر کا نام نہ ہونے سے اس ڈرامے کی ملکیت سے انہیں کوئی روک

سکتا تھا کہیں پھول میں غزل وغیرہ میں شاعر کا نام آجاتا ہے تو اسکی ملکیت کے دعویٰ کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا میں نے دوسرے مصنفین کی طرح شری کرشن اور نتھارام کے وارثوں سے پوچھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ خود مختلف مقامات پر جاکر بزرگ موجودہ اداکاروں سے دریافت کرنے اور کتابوں کو ایک سرے سے دوسرے تک مشہور پڑھکر یہ نتیجہ نکالا ہے ویسے کچھ کتابوں کے آخر میں شاعروں نے اپنے تخلص کا استعمال نہیں کیا ہے لیکن ڈرامے کی منظوم عبارت اس کی غمازی کررہی ہے کہ میں کیسے مشق شاعر کی دین ہوں بہرحال میں اندرمن اسکول کے اکھاڑے کی نوٹنکی کا حال لکھ رہا تھا جو انیسویں صدی کی تصنیف ہے اور اسکے مقابلے پر لکھی ہوئی مرلی دھر کی کتاب سانگیت نوٹنکی سے کچھ اشعار پیش کررہا ہوں مرلی دھر کے بارے میں ہاتھرس کے مشہور شاعر اور پبلشر دیپ چند کھورے لعل کے لڑکے نے مجھے بتایا کہ مرلی دھر استاد باسم کے شاگرد تھے جبکہ ۱۹۱۵ع کہ ماسٹر نہالچند بکسیلر کے توسل سے چھپی ہوئی مرلی[1] دھر کی تحلیق شدہ نوٹنکی اردو میں انہیں اندرمن کے اکھاڑے کے مشہور معروف شاعر لکھا[2] گیا ہے۔

منگلا چرن (حمد) : دگھن برن وارد وردن کرن سدا کلیان
باسدیو کوشوسوں دیو اٹھے بردان

چوبولہ : دیوالھے سردان پرتھم شری گنپت تمہیں منادیں
اشٹ سدھ نودھ ورودھ اسن جگ پرسدھ تے دھاویں
چتر اس سے وید چاروں تمرویش گادیں
شیش سریش مہیش دنیش دھنیش پار نہیں پاویں

دوڑ : مدت مودک من بھاوت سکھد منگل سرساوت ہاتھ ترشول
گھماوت اسکل کھلن ڈراوت جے شری جے گجندن تمہار ومر سیدھر گن گاوت

---

۱ سرورق سانگیت نوٹنکی از مرلی دھر

۲ رام نرائن اگروال نے انہیں باسدیوجی عالم کا شاگرد لکھا ہے
لوک ناٹیہ پرمپرا

جواب پنجابی کا بھاوج سے .

دوہا .

میں اپنے گھر پر بھلا آیا کھیل شکار اسپ لگایا تھاں سے کھولدھرے پتھیار

چوبولا

کھولدئیے پتھیار جلد بھاوج تو پاس پیادے نہائیں گے اسوقت گرم کر نیکو جل دھروادے
بہت جلد کھانا کر کے مجھکو ابھی کھلادے کمرے کے اندر نواڑ کا پلنگ میرا بچھوادے

دوڑ

وہ حقا (حقہ) تازہ کرکے ، چلم کو دھردے بھرکے
جوزیادہ دیر لگادے ، ہوئے ناخوشی میری عصہ بدن میرے میں آوے

اس سوانگ کی زبان بھی دیہاتی برج بھاشا ہے لیکن اندرمن کے اکھاڑے کے سوانگ سے زیادہ عام فہم ہے اسلئے یہ زیادہ مقبول ہوا. لیکن اسکے بعد ۱۹۲۳ ع میں مضطر کا لکھا ڈرامہ « نقلی مالی » جسکا سن تصنیف کتاب پر مرقوم ہے سے بھی کچھ اشعار سنئیے اور اندازہ لگائیے کہ عوام کا مزاج کتنا بدل گیا تھا جو یہ ڈرامہ بے حد مقبول ہوا اور اسکے آگے اسکے بعد بھی نوٹنکی سوانگ لکھے گئے لیکن اسکے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکے اسکے برعکس یہ ڈرامہ اس قدر مشہور ہوا کہ اس ڈرامائی صنف کا نام ہی نوٹنکی پڑگیا مضطر صاحب کا منگلا چرن (حمد) ملاحظہ فرمائیے .

دوہا : بندوں کے اوپر رکھیے ہر دم مہر نگاہ
پاک ذات مولا تری پاک تیری درگاہ
صفت کروں کیا زمین و فلک پر کھلا نور ہے تیرا
سمجھیں تمکو پاس نہ لیکن مکاں دور ہے تیرا
بڑا سہارا صبح و شام مجھکو غفور ہے تیرا
اس خادم کو خداوند ہردم غرور ہے تیرا

بحر طویل :

عقل حیراں ہے دوجہاں میں عجب کھیل قدرت کے کیا کیا دکھائے تونے
بے سہاروں کا گردوں سا کر کے کھڑا ، پر چاند سورج ستارے لگائے تو نے

وہ چلاتی ہوا جو دکھائی نہ دے کیا خداوند دریا بہائے تونے
اور گوہر صدف میں ہے پیدا کئے خاک سے گل چمن کے لگائے تو نے

دوڑ : نہ ہو بعریف ادا ہے . مجھے تجھی سے ہی ملا ہے
بھروسہ آزادی کا کہوں فسانہ پھول سنگھ نولنکی شہزادی کا

دوہا : جہاں ہیں پنجاب کے لوگ بخوبی طور
اسی ملک کی سنو یہ داستان کر غور

چوبولہ : پھول سنگھ پنجابی اک ہوتے ہی بڑے عمر کے
گیا کھیلنے کو شکار گھر سے تیار ہوکر کے
کرتے کرتے سیر بہت کچھ عرصہ گزر گیا گزر کے
واپس آپہونچا مکان پر عنقریب دوپہر کے

دوڑ :- سفر کا تھکا تھکایا، بھوک پیاس کا ستایا، بڑی دل کی بیتابی، کہے اندر بھاوج سے بولا پھول سنگھ پنجابی

ایک اچھے شاعر کا لکھا ہوا منظوم ڈرامہ، زبان سلیس با محاورہ، فن کے حدود سے قریب ہونے کی وجہ سے ہر جگہ پسند کیا گیا یہ سوانگ چونکہ صرف مخصوص طور پر کمپنی کیلئے لکھا تھا اسلئے نکری کیلئے اسکا نام نوٹنکی نہ رکھکر "مقلی مالن" رکھا گیا اسکے مقابلے میں شری کرشن کھتری نے رادھا رمن سے نولنکی سوانگ لکھوایا جو اس نے اس سوانگ کو سامنے رکھکر لکھا ہے کیونکہ دونوں کے اشعاروں میں مضمون میں اور بیان میں کافی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

منگلا چرن یا (حمد)

رقم قلم حمدِ خدا کر اول اور آخیر
کن سے عالم کو کیا جس نے یا توقیر

چوبولہ :- جس نے باتوقیر نیز تحریر شان سے کم ہے
اللہ تعالیٰ جاہ و جلال رازق شاہ عالم ہے
بردبار باری برحق عادل اشرف اکرم ہے
شری کرشن امداد کنندہ دائم اور قائم ہے

دوڑ : رب العالمین لا مکاں - درخشاں نور لا بیاں
مدد دیگا حق تعالیٰ لکھوں شہزادی نوٹنکی کا سنگیت نرالا

دوہا : ودت دیش پنجاب ہے پچھم کے درمیان
حال وہیں کا دوستو ہوں کرتا آج بیاں

چوبولہ : کرتا آج بیاں دھیان دے سن لو مضمون سارا
بھوپ سنگھ چھتری کا بھائی پھول سنگھ تھا پیارا
ایک دن وہ ہی شکار کھیلتے ہوئے فجر سدھارا
لوٹ دوپہر کو گھر آیا تھکا دھوپ کا مارا

دوڑ بدن کمہلائے گیا سب، تشنگی سے سوکھے لب
بھوک سے جی گھبرایا، کہیں کشن فوراً اسنے بھابی سے یوں فرمایا

شاعر رادھا رمن نے کافی صاف زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن پھر بھی مضطر والے سوانگ کی مقبولیت کو نہیں پہنچا۔ میں ہریانے کے مشہور سانگیت شاعر لکھمی چند کے سوانگ سے بھی کچھ اشعار ذائقہ بدلنے کیلئے دے رہا ہوں۔ اس سوانگ کی طرز جداگانہ ہے۔ ہریانوی زبان اور راگ راگنیوں سے بنا ہوا قدیم سوانگ قدیم سانگیت کی نشانی ہے۔ ابتدا دوہے کے منگلا چرن سے ہے۔ دوہے کے بعد نثر میں ایک ایکٹر تقریر کرتا ہے اور قصے کے بارے میں بتاتا ہے۔ اس میں جدید نوٹنکی ڈراموں کی طرح رنگا نہیں ہوتا۔ اس نوٹنکی سوانگ میں ابتدا میں ہی ایک کردار سیٹھانی کا اور بڑھا دیا گیا ہے وہ پھول سنگھ کی بھاوج سے اسکی شادی کے بارے میں کہتی ہے۔ کہنا سیٹھانی کا (خاص نئی راگنی)

لچھمی روپ ویر کاہو سے گھر بھرونا چہیئے
بائے کسو سے پھول سنگھ کا بیاہ کروانا چہیئے
پیہر ساہرا دونوں کولاں کی آخر دوائی چہیئے
دیور جیٹھ ست سرے سسر کی کارن دکھانی چہیئے
ساس نند چھوٹی بڑی سب میں جاڑن راکھنی چہیئے

پتی سیوا پرجا پالن کی باڑن راکھنی چاہیئے
تیرا دیور جوان گھوٹ کے نیا داغ مرواڑنا چاہیئے
یا ہے کسو سے پھول سنگھ کا بیاہ کرانا چاہیئے
بچار۔ دھن مایا کا اور ہیں کوئی مالک بچا کوئی نا
بیاہ کر اوڑن کا منصوبہ تہارے دل ہے سچا کوئی نا
بوجھ سر تے فرض تاڑنا چاہیئے کوارا اچھا کوئی نا
پھول سنگھ سب سمجھ ہے انساں عقل کا کچا کوئی نا
دیہی دھام جوڑے میں سدھے کے پھر واڑانا چاہیئے
یا ہے کسو سے پھول سنگھ کا بیاہ کرانا چاہیئے[1]

اتنی لمبی تمہید میں نے نوٹنکی ڈراموں کی زبان کا لسانی فرق اور مقبولیت اور اسکے نوٹنکی نام پڑنے کی تفصیل کیلئے کی ہے کیا کہا جائے جب کسی موضوع پر قلم اٹھایا جاتا ہے تو مصنف کا قلم نہیں رکتا۔ باوجود عدیم الفرصتی کے دوستوں کی فرمائش پر یہ مضمون ترتیب دینے کو تیار ہونا پڑا کیونکہ قومی آواز اور شاعر کے نوٹنکی مضامین میرے اسوقت کے مصامین تھے جبکہ مجھے اس صنف کے بارے میں بہت قلیل معلومات تھیں۔ انشا اللہ حیات باقی رہی تو اس موضوع پر کتاب بھی پیش کرونگا۔ علیگڑھ نمائش میں نوٹنکی آنے کی خبر سنکر مجھے پریکٹیکل طور پر اسکا ایک شو دیکھنے کو تیار ہونا پڑا۔ یہ عمر اور نوٹنکی دیکھنا آج کے معاشرے میں معیوب اور مذہبکا چیز سمجھا جاتا ہے۔ آج سے چالیس پچاس سال قبل یہ بات نہ تھی اچھے اچھے پڑھے لکھے اور اونچے طبقے کے لوگ اس کو دیکھتے تھے۔ اور اسکے ڈراموں کے شوؤں کا انتظام کرواتے تھے۔ کیونکہ اس میں انھیں کلاسیکل موسیقی اور فنکاری ملتی تھی۔ لیکن اب وہ دور بدل چکا ہے مغربی تہذیب کے اثر سے کلاسیکل موسیقی اور رقص کی قدر و قیمت گھٹ چکی ہے۔ سینما کے ڈراموں کے آگے ان ڈراموں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ اس صنف کو مبتذل اور بازاری

۱۔ سوانگ نوٹنکی از لکھمی چند

سمجھنے لگا ہے۔ جبکہ حالات نے انہیں بازاری بننے پر مجبور کیا۔ نہیں تو اس صنف میں تہذیب اور شائستگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مجھے میرے وطن کے خان امراؤ خاں عادل وارثی نے بتایا کہ انہیں سانگیت کے مشہور استاد گنگی مل کھتری نے بتایا تھا۔ کہ ان کی جوانی میں یعنی ۱۸۹۰ء کے قریب ہاتھرس کے مشہور مرلی دھر کی پارٹی ڈبائی میں سوانگ کر رہی تھی۔ ایک محلے کے چوراہے پر تخت ڈالکر اسٹیج بنادیا گیا تھا اسکے تین طرف عام لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پیچھے کی طرف عورتیں۔ کچھ عورتیں گھروں کی چھتوں پر بھی بیٹھی تھیں۔ اس زمانے میں سوانگ پارٹی میں عورتیں کام نہیں کرتی تھیں بلکہ اسکے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ درگاہ قلی خاں نے مرقع دہلی میں لکھا ہے کہ محمد شاہ درباری بھگت تقی کے یہاں خوبصورت لڑکے سوانگ اور رقص کرتے تھے اورامانت نے اندر سبھا دکھانے کے لئے خوبصورت لڑکوں کا ہی انتظام کیا تھا۔ پارسی تھیٹریکل کمپنی میں بھی نسوانی پارٹ نوجوان عمر کے لڑکے ہی کیا کرتے تھے۔ یورپ والوں کے ڈراموں اور سینماؤں کے اثر سے سب سے پہلے ہندوستانی سینماؤں نے کجن بائی وغیرہ کو نسوانی کردار کے لئے عورتوں کی جگہ استعمال کیا گیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ۱۹۳۵ء کے بعد ترموہن نے سوانگ کے اسٹیج پر نسوانی کردار کیلئے عورتوں کا استعمال کیا۔ بہرحال میں عرض کررہا تھا کہ مرلی دھر کی پارٹی ڈرامہ کر رہی تھی۔ ایک نوجوان اداکار جو کوئی زنانہ پارٹ کر رہا تھا۔ اسکی نگاہ چھت کی جانب اٹھ گئی استاد مرلی دھر اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس نگاہ کو دیکھ لیا۔ اس وقت تو کچھ نہیں بولے لیکن تماشہ ختم ہونے کے بعد اس اداکار کو پارٹی سے نکالدیا۔ کیونکہ یہ اکھاڑے کے اصول کے خلاف تھا۔ اس سے اکھاڑے کی پاکیزگی مجروح ہوتی تھی۔ آج سینماؤں کو دیکھیئے وہ یورپین فلمی تہذیب کی نقل میں جنسیت کی حدود کو اسٹیج پر ہی پار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوانگ دیکھنے والوں کو خوش کرنے کیلئے نوٹنکی کے زنانہ اداکاروں کو بھی اب تھوڑا بہت بازاری پن کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بازاری پن موجودہ سینماؤں کی اسٹیج کی بے حیائی کے برابر پھر بھی نہیں پہنچتا۔ پریشانی یہ ہے کہ پکچر بنانے والوں کا مقصد صرف پیسہ پیدا کرنا ہوتا ہے، انہیں اپنی سماجی تہذیب اور روایات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اب میں اس موضوع پر آتا ہوں جسکو میں مضمون کی ابتدا میں بیان کررہا تھا۔ اور دوسرے موضوعات درمیان

میں آجانے کی وجہ سے میں اس موضوع سے ہٹ گیا تھا۔ کہ حمید اترولی والے کی سانگیت پارٹی گاؤں میں آئی ہوئی تھی، برسات کے دن تھے، موے اس مکان کے دروازے پر جس میں میں کرائے پر رہتا تھا، باہری چوک میں نوٹنکی ڈرامہ کرانے کا انتظام ہوا اسوقت کے قاعدے کے مطابق بیچ چوراہے پر چند تخت ڈالکر اسٹیج بنا دیا گیا۔ موٹے کپڑے کا فرش جو دوہڑا کہلاتا ہے، نیچے بچھا دیا گیا تھا ایک دوہڑے کا فرش اسٹیج پر بھی بچھادیا گیا تھا۔ چار تخت اسٹیج کے لئے ایک دوسرے سے ملاکر بچھائے گئے تھے۔ عام طور پر سمجھئے کہ جیسے مشاعروں کی اسٹیج کی طرح تماشہ دس بجے کے بعد شروع ہوتا تھا اور پھر رات گزارتے ہوئے صبح فجر کے وقت تک چلتا تھا۔ بچوں نے فرش پر ۹ بجے سے ہی قبضہ کرلیا تھا۔ دو گیس لالٹینوں کا انتظام کیا گیا تھا، ایک اسٹیج پر دوسری ناظرین کے لئے۔ آہستہ آہستہ لوگ آنے شروع ہوئے اور اسٹیج پر سب سے پہلے نقارہ لایا گیا۔ جسے نقارچی نے خوب اچھی طرح آگ پر سینک لیا تھا۔ آگ قائم رکھنے کیلئے اپلے اور کوئلے سلگادئے گئے تھے تاکہ ان سے تماشے کے اختتام تک کام میں لایا جاسکے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب نقارچی نے نقارہ بجانا شروع کیا۔ نقارے کی گونجدار آواز پورے علاقے میں سنائی دینے لگی بلکہ قریب کے موضعات تک پہنچنے لگی اسکی آواز میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ جیسے شمع کے جلنے پر پروانے اس کی جانب کھنچے چلے جاتے ہیں۔ گاؤں کے شوقین لوگ سارے کاموں سے فارغ ہوکر ٹولیاں بنا بناکر آپس میں باتیں کرتے ہوئے مقام تماشہ پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگے یا آنے شروع ہوگئے۔ کیونکہ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں سوانگ شروع ہو نہ جائے کیونکہ نقارہ تماشہ شروع ہونے کا الارام ہوتا ہے۔ برادرم ڈاکٹر قمر رئیس نے مجھے بتایا تھا کہ بچپن میں کئی بار شاہجہاں پور میں وہ نقارے کی آواز پر ساتھیوں کے ساتھ سوانگ دیکھنے گئے تھے۔ قریب دس پندرہ منٹ بعد ہارمونیم ماسٹر اور ڈھولک بھی اسٹیج پر آئے۔ دوسرے اداکار پاس ہی کے کچھ کمروں میں اپنی اپنی ڈریس بدلکر اسٹیج پر آنے کی تیاری میں مصروف تھے، کچھ میک اپ کر رہے تھے۔ ڈرامہ «محبت کی پتلی» فیروز مالی کہلاجانے والا تھا۔ اس زمانے میں سوانگ نوٹنکی خدا دوست، مستانی گوجرنی، لیلیٰ مجنوں نیومتی جگدیو زیادہ مشہور تھے۔ «فیروز مالی» کا مختصر پلاٹ یہ ہے کہ فارس کے بادشاہ کے اپنے مرنے سے پیشتر یعنی کچھ روز قبل ایک لڑکا پیدا ہوا جسے

بادشاہ نے مرتے وقت اپنے وزیر افضل کے سپرد کرجاتا ہے۔ شاہ کے مرنے کے بعد شہزادے کے بالغ ہونے تک حکومت کی باگ ڈور افضل سنبھالے رہے، اور بالغ ہونے پر تخت اسکے سپرد کردے لیکن کچھ دنوں کے بعد وزیر افضل کی نیت بدل جاتی ہے، اور تخت پر ہمیشہ قابض رہنے کے لئے وہ شہزادے کو جلادوں کے ذریعے قتل کرانے کو جنگل میں بھیج دیتا ہے۔ وہاں جلادوں کو لالچ دیکر ایک مالی شہزادے کو بچالیتا ہے اور اسکی پرورش اپنے گھر میں ہی اپنی اولاد کی طرح کرتا ہے۔ اس شہزادے کے گلے میں ایک تعویذ بھی ہے جو اسکے والد (بادشاہ) نے مرتے وقت پوشیدہ طور پر اسکے گلے میں ڈالدیا تھا ادھر افضل کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جسکا نام شمسہ رکھا جاتا ہے۔ لہذا شمسہ محلوں میں اور فیروز مالی کے یہاں پرورش پاتا ہے۔ شمسہ کو شادی سے نفرت ہے، افضل اسکی شادی اپنے سپہ سالار طغرل سےکرنا چاہتا ہے جسے شمسہ سختی کے ساتھ منع کردیتی ہے۔ لیکن جب فیروز مالی محلوں میں ہار گوندھکر لیکر آتا ہے تو یہ اس پر عاشق ہوجاتی ہے اور فیروز بھی شمسہ کو پسند کرنے لگتا ہے۔ اور پھر انکی محبت پروان چڑھتی اور بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ راز آشکارا ہوجاتا ہے تو سپہ سالار طغرل سخت ناراض ہوتا ہے۔ اور شمسہ کو قید کرلیتا ہے اور کافی ڈراتا دھمکاتا ہے اور سمجھاتا ہے: مگر نتیجہ کچھ نہ نکلنے پر اسکو زنجیروں سے جکڑ کر چوک میں بٹھادیا جاتا ہے اور شہر میں منادی کرادی جاتی ہے کہ کوئی اسے دانہ پانی نہ دے۔ اسی طرح کئی دن گزر جاتے ہیں۔ فیروز اسکے لئے گھر گھر جاکر کھانا پانی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کوئی مدد نہیں کرتا۔ پھر بھی یہ دونوں اپنی محبت میں ثابت قدم رہتے ہیں یہ سب کچھ دیکھکر شاہ افضل اور سپہ سالار طغرل فیروز کو برسرعام بغاوت کا الزام لگاکر قتل کرنا چاہتے ہیں۔ سب سردار اور رعایا جمع ہوتی ہے مالی بھی فیروز سے ملنے آتا ہے۔ اور موقع پاکر وہ راز کھول دیتا ہے اور فیروز کے گلے کے تعویذ سے افضل کی غداری ثابت ہوتی ہے۔ طغرل اور افضل کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور فیروز کو اسکا غصب کیا ہوا تخت شاہی مل جاتا ہے اور پھر شمسہ کی سفارش کرنے پر افضل اور طغرل دونوں کو معاف کردیا جاتا ہے۔

(باقی اگلے شمارے میں)

کتابی دنیا

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
(تبصرہ نگار)

اردو کی چند کتابوں پر ایک طائرانہ نظر

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زبانِ اردو کی وضع و ساخت، تراش و خراش اور نشونما میں جہاں کشمیر کے پنڈتوں، مہاراشٹرہ کے سنتوں، پنجاب کے سکھوں، گجرات کے ناگروں، اترپردیش کے کایستھوں، بمبئی کے پارسیوں اور کلکتہ کے عیسائیوں نے بڑا حصہ لیا ہے وہاں ہندوستان کے تمام علاقوں کے مسلمانوں نے بھی اس عوامی زبان کی نشر و اشاعت، ترویج و ترقی اور تحفظ و بقا کی خاطر زبردست رول ادا کیا ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ یہ مثالی زبان ہر سطح پر مذہبی رواداری، ثقافتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی نہ صرف مظہر ہے بلکہ موثر ذریعہ ہے اور سرتیج بہادر سپرو کے الفاظ میں یہ مشترکہ زبانِ اردو ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔

مقام مسرت ہے کہ کل ہند ریڈیو بمبئی بزم اردو کے نام سے ایک مخصوص پروگرام نشر کرتی ہے جو دلچسپ ہی نہیں بلکہ مقبول ہوتا ہے۔ محبان اردو اس پروگرام کے لئے خصوصی طور پر سپاس گزار ہیں۔ آج کی اس مختصر سی ادبی نشست میں اردو کی چند کتابوں پر اظہار خیال کیا جائیگا جو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کے کتبخانے میں بطور عطیہ یا انسٹی ٹیوٹ کے ترجمان "نوائے ادب" کے لئے بغرض تبصرہ موصول ہوئی ہیں یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کی گرانی اور طباعت کی دشواری کے ساتھ آجکل کے ناہموار

حالات اور ناخوشگوار ماحول میں معیاری کتابوں کی اشاعت اور انکی نکاسی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بہر حال، چندے از خروارے کے مصداق اردو جیسی مقبول زبان کی چند ادبی کاوشوں پر نقد و تبصرہ کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش کی جائیگی۔

یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال جیسے شہرۂ آفاق شاعر و فلسفی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے اور یہ ادبی نگارشات اردو ادب میں "اقبالیات" کے نام سے یاد کیجاتی ہیں۔ ہر دانشور اور ہر قلمکار اپنے زاویۂ نظر سے علامہ اقبال کے افکار و تصورات پر اظہار خیال کرتا ہے اور نئے نکات کی نشاندہی کرتا ہے اور دعوت فکر دیتا ہے۔ اسی قبیل کے ایک عالم و فاضل اور محقق و نقاد سید مظفر حسین برنی صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے فکر و فلسفہ کو انکے کلام کے پس منظر میں ایک بلند پایہ تالیف "محب وطن اقبال" کے نام سے شائع کی ہے جو "اقبالیات" کے ذخیرے میں ایک زبردست اضافہ تصور کی جاسکتی ہے بلکہ اسے ایک سنجیدہ اور محققانہ ادبی کاوش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اقبال کی وطن دوستی پر ایماندارانہ تبصرہ ملتا ہے تو دوسرے باب میں ان کے فکر و فلسفہ پر ہندوستانی علوم کے اثرات کا جایزہ۔ تیسرے اور چوتھے بابوں میں اقبال کے تصورات کی روشنی میں تحریک آزادئ ہند اور قومی یک جہتی کے نظریے کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں برنی صاحب نے اقبال کے فکری سرمائے کا صحیح تجزیہ کرکے اسے عالم انسانیت کی رہنمائی کا سبب قرار دیا ہے۔ اور اسطرح ہندوستانی دل و دماغ کو جو مغرب کی سامراجی طاقتوں سے مرعوب ہوتی ہیں انکی سطحیت کا احساس دلانے کی سعی کی ہے تاکہ ہر ہندوستانی بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلالحاظ رنگ و نسل ہر فرقہ کے عقائد اور تعلیمات کا ادراک کرسکے اور بقول اقبال ع "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" کے مصداق ع "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" کہنے پر بجا طور پر فخر کرسکے۔

دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کی زیر سرپرستی مسعود الرحمان خاں ندوی نے "مطالعۂ سلیمانی" کو مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ہے ان پرمغز مقالات اور بصیرت

افروز خطبات کا جو دنیاے ادب کی ناقابلِ فراموش ہستی مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی، تحقیقی و فکری اور دینی و ملی خدمات کے سلسلے میں بزم مذاکرہ منعقدہ بھوپال میں پڑھے گئے تھے۔ در حقیقت "مطالعۂ سلیمانی" ایک طرف وقیع اور ضخیم ہے تو دوسری جانب پراز معلومات اور جاذب نظر بھی۔

زیر نظر کتاب "مطالعۂ سلیمانی" میں ادبی چاشنی اور شیرینی کے ساتھ سلوک و معرفت کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ تالیف اپنی بوقلمونی کے اعتبار سے زبان و ادب، صحافت و انشا، تاریخ و سیرت، تہذیب و ثقافت اور تحقیق و تنقید کی انسائیکلوپیڈیا یعنی قاموس قرار دی جاسکتی ہے۔

مختصراً زیر تبصرہ کتاب میں سید سلیمان ندوی صاحب کی تصنیفی و تالیفی نفاست کا نہ صرف ادبی جائزہ ملتا ہے بلکہ انکے حسنِ ذوق اور نظم ترتیب کا جاوداں نمونہ بھی۔ یہ تالیف "سلیمانیات" کے سرمایے میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ظاہری و باطنی دیدہ زیبی کے علاوہ کتابت و طباعت کے اعتبار سے ناشرین کے خلوصِ دل، ذوقِ نظر اور حسنِ عمل کی ترجمانی کرتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر عنوان چشتی تعارف کے محتاج نہیں۔ دنیاے اردو میں ایک نامور ادیب، نقاد اور شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "عروضی اور فنی مسائل" کو ڈاکٹر عنوان چشتی نے تالیف کیا ہے جو افادی حیثیت سے اہم ہی نہیں بلکہ اردو کے کلاسیکی دستاں کی آئینہ دار ہے۔ یہ بلند پایہ تصنیف گیارہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ "شکست ناروا" میں رباعی کے اصول و اوزان اور شعری آہنگ و لہجہ کی وضاحت کی گئی ہے تو عروضی تجزئیے اور تجربے کی روشنی میں مرزا غالب کے کلام کا عروضی تجربہ اور اصغر گونڈوی کی شاعری کا عروضی جائزہ ملتا ہے۔ عروضی تجربوں کے ساتھ ہندی چھندوں کی تلاش و جستجو کی صراحت ہوتی ہے جو دراصل عروضی تنقیـد کی عکاس ہے آخر میں عنوان صاحب نے ابرا حسنی گنوری کے نظریۂ فن اور اصلاح سخن پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو شاعری میں اصلاح سخن کی باز یافت کی ہے۔

موضوعات اور مباحث کے لحاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ بلند پایہ تصنیف اردو ادب میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی تالیف ہے جس میں مصنف موصوف نے تفصیل سے فنی اصول اوز عروضی امکانات پر بحث کی ہے جسے ایک کامیاب کوشش کہا جاسکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ، عروضی اور فنی مسائل، کلاسیکی تنقید پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جو اردو کے ہر انشا پرداز کے لئے ضروری اور ہر شاعر کے لئے ناگزیر ہے۔

'افکار گریزاں، کے مصنف ڈاکٹر کیشو چندر سین عرف حقیر آستانی ہیں جو ایک ممتاز دانشور اور عالم ہیں اور ایک کلاسیکی شاعر بھی۔ اگرچہ حقیر صاحب کلاسیکی شاعری سے زیادہ قریب ہیں لیکن روایتی شاعری سے زیادہ مزاجی طور پر آزاد نظم پیش کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔

'افکارِ گریزاں، کو ماہنامہ شان ہند نئی دہلی نے شائع کیا ہے جس کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے ؂

وقت کے ساتھ حادثات گئے
حاصلِ حادثات باقی ہے

اس مجموعہ میں نظمیں غزلیں اور گیت ہیں جو ایک طرف دور حاضر کی داخلی کیفیات اور خارجی مشاہدات کی عکاسی کرتی ہیں تو دوسری جانب جدو جہد کا اظہار بھی۔ ودیا پرکاش سرور تونسوی صاحب نے حقیر آستانی کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے بجا فرمایا ہے کہ 'افکارِ گریزاں، کی جادو اثری اور سحر آفرینی وہ جرأت رندانہ ہے جسے دوا اور داروے دردِ جگر سے بھی تعبیر کیا جاسکتا اور شرح حیاتِ بشر کی تفسیر بھی۔

حقیر آستانی کے شعروں سے دورِ حاضر کے تقاضوں کی تجرباتی بصیرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور ذہنی شعور اور جذباتی حس کی تفہیم بھی۔ ملاحظہ ہوں چند شعر ؂

حقیر کہتے ہیں اس کو ہی منزلِ مقصود
جو لے گئے اپنے ہی پہلو میں جستجو آئے
نہ تاسف افسوسِ ماضی، فکرِ فردا، آج کا غم کیا

که جس کے حال پہ اے جانِ جاناں مہرباں تم ہو
ہم جارہے ہیں سوئے عدم اپنے شوق سے
کب تک جئیں گے عمر کا احساں لئے ہوئے
وضعداری، اپنا پن، اخلاص، ہمدردی، لحاظ
سب کے سب مٹے ہوئے نقش بر دیوار ہیں
آج اس رنگ میں آج اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں
کسقدر رنگین طبع اس دور کے معمار ہیں
دین کے، نسل کے، رنگ کے نام پر
موت کے گھاٹ لاکھوں اتارے گئے

کوکن رائٹر گلڈ شاخ نیروبی (کینیا) نے "کوکن کے سپوت" نامی ایک کتاب پیش کی ہے جس کو جناب انجم عباسی اور شیخ اسماعیل صاحب نے مرتب کیا ہے۔

"کوکن کے سپوت" میں اکیس انٹرویوز اور تین سوانحی خاکے ملتے ہیں اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کتاب میں غیر شعوری طور پر ان نامور شخصیتوں کو نظر انداز کیا گیا ہے جنہوں نے کوکن یعنی مسلم کوکن کے بنانے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ امید کیجاتی ہے کہ جب اس کتاب پر نظر ثانی کیجائیگی اس وقت کوکن کے ان تمام ممتاز ہستیوں کو شامل کیا جائیگا جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرکے اپنی انفرادی زندگی میں کوکن کے نام کو روشن کیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں بہاءالدین دادو کر صاحب جیسے پروفیسر، عبدالقدوس منشی صاحب جیسے پرنسپل، مہر مہلائی صاحب جیسے شاعر، عبدالرحیم اندرے صاحب جیسے ڈاکٹر، عبدالحمید بوبیرے صاحب جیسے صحافی اور عبدالکریم نائیک صاحب جیسے سماجی کارکن کی زندگی کے خاکے ملتے ہیں اگرچہ وہ ادھورے اور نامکمل ہیں بہر کیف کوکن اردو رائٹرز گلڈ کی یہ پیش کش قابل ستائش ہے۔

المختصر آج کی اس ریڈیائی ادبی محفل میں صرف پانچ کتابوں پر تبصرہ کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ ادبی اعتبار سے یہ تبصرے سطحی اور سرسری ہیں۔

(بشکریۂ کل ہند ریڈیو، بمبئی)

مقالہ

ادبیات

شمیم اختر صاحبہ

راجہ رام نارائن موزوں اور انکا کلام

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۸۷ء جلد ۱۳۹ ص ۶۰ ۔

راجہ رام نارائن کے وارث درگا پرشاد المتخلص بہ شاد عظیم آبادی نے جب دیوان موزوں مرتب کر کے ۱۲۸۷ ھجری میں شائع کیا تو اس میں انکا مختصر تذکرہ بھی شامل کردیا گیا۔ اس میں راجہ رام نارائن اور انکے ورثا کا ذکر تو ہے لیکن راجہ رام نارائن کی جائے پیدائش، سنہ ولادت اور انکے والد کا نام تک تحریر نہیں ہے۔

بتقاضائے زمانہ رام نارائن کی تدریس و تعلیم بھی فارسی زبان کے ذریعہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے فارسی زبان و ادب پر مہارت حاصل کرلی۔ انکی شادی شاہی دربار کے ایک ہندو امیر کی دختر نیک اختر سے ہوئی اور وہ عظیم آباد کی سرکار میں ملازم ہوئے۔

راجہ رام نارائن نے اپنی غزلوں میں صرف شیخ علی حزیں کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے۔ رام نارائن میں نہ صرف شاعرانہ صلاحیت تھی بلکہ انکو فی البدیہہ شعر گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی۔

راجہ درگاپرشاد نے انکا دیوان ۱۲۸۷ ھجری میں مرتب کرکے منشی نولکشور کے مطبع (لکھنؤ) سے شائع کیا۔ اس دیوان میں رباعیات بھی ہیں لیکن ان کی غزلیں ہی سرمایہ افتخار ہوسکیں۔

یونس اگاسکر

ملک خوشنود کی مثنوی «جنت سنگار»

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۸٦ء

جلد ۳٦ شمارہ ۲، ص ۷۴ - ۸۵

قرائن سے لگتا ہے کہ «جنت سنگار» جیسے «ہشت بہشت» اور «بازار حسن» کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے نہ صرف گولکنڈے میں ہی لکھی گئی ہے بلکہ اس وقت لکھی گئی جب ملک خوشنود میر محمد مومن کے دامن سے وابستہ تھا۔ اس کا تعلق دربار شاہی سے نہ تھا اس لئے اس کی مثنوی میں سلطان محمد قطب شاہ یا اس خاندان کے بادشاہ کی مدح نہیں ملتی۔

جہاں تک مدح سلطان محمد عادل شاہ کا تعلق ہے غالباً اس کا اضافہ اس وقت کیا جب وہ بیجاپور کے دربار سے وابستہ ہوگیا تھا۔

خوشنود کے کلام کے مطالعے سے یہ بات ابھر کر واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور پختہ مشق شاعر ہے اور مختلف اصناف سخن پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔

«جنت سنگار» کا فنی جائزہ ایک ترجمہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک طبع زاد تصنیف کی صورت میں لیا جائے تو ہمیں انکے فن سے مایوسی نہیں ہوگی۔

حیات اللہ انصاری

اصل گل بکاولی

ماہنامہ آجکل دہلی، نومبر ۱۹۸٦ء، جلد ۴۵ شمارہ ۴ ص ۱۰-۱٦

گل بکاولی تخیل کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ سچا پھول ہے جو سائز میں موگرے کے پھول کے برابر ہے۔ اس کی پتیاں گول ہیں لیکن بیچ بیچ میں چند نوکیلی پتیاں بھی ہیں۔ سب پتیاں موگرے کے پھول کی پتیوں سے پتلی ہیں۔ پھول سفید ہے لیکن بیچ میں ذرا سا زعفرانی پن بھی ہے۔

گل بکاولی کی کہانی میں یہ پھول اپنی اس شہرت پر کہ وہ آنکھ کی روشنی کے لئے مفید ہے، قصہ کی بنیاد بنا ہے۔ یہ پودا وادی امرکنٹک میں پایا جاتا ہے۔ امرکنٹک جنوبی ہندوستان کے پلیٹو پر واقع ہے۔ کٹنی اور رائے پور کے درمیان ایک اسٹیشن پڑتا ہے پنڈرہ، وہاں سے سڑک جاتی ہے جس پر ۴۵ کلومیٹر طے کرنے کے بعد امرکنٹک آجاتا ہے۔

اس مطالعے سے اتنا واضح ہوجاتا ہے کہ گل بکاؤلی کا وجود اور اسکی شہرت کہ وہ آنکھ کیلئے مفید ہے۔ دونوں باتیں اس بات کا پکا ثبوت ہیں کہ اس کہانی کا عمل وقوع امر کنٹک ہے۔

مرزا حامد بیگ

عزیز احمد کی تاریخی کہانیاں

ماہنامہ شبخون الہ آباد، اگست۔نومبر ۱۹۸۶ع جلد ۱۹ شمارہ ۱۴۳ ص ۵۵۔۶۵

عزیز احمد اپنے مضمون «افسانۂ افسانہ» (مطبوعہ سویرا لاہور) میں بیانیہ کے زبردست حامی دکھائی دیتے ہیں اور چونکہ بیانیہ کیلئے «حقیقی واقعہ» ضروری ہے اسلئے افسانے کی سب سے مضبوط بنیاد «واقعہ» کو قرار دیتے ہیں۔ اسی مضمون میں انہوں نے کہا ہے کہ افسانے کا مقصد قریب قریب وہی مقرر پاتا ہے جو تاریخ کا مقصد ہے۔ یعنی واقعات کی حقیقت کا اظہار۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عزیز احمد کا یہ مضمون ان کی تاریخی کہانیوں اور ناولٹس کو سمجھنے کی کنجی ہے، چونکہ اس مضمون میں عزیز احمد نے واقعہ کو افسانے کے کردار کی اصل کسوٹی بھی قرار دیا دیا ہے۔ عزیز احمد جان بوجھ کر اپنے افسانوں میں «کہانی» کو «پلاٹ» بننے سے روکتے ہیں۔

محمد توقیر خاں

غالب۔ انفرادیت میں اجتماعیت

ماہنامہ کتاب نما دہلی، جنوری ۱۹۸۷ع جلد ۲۷ شمارہ ۱، ص ۳۹۔۴۲

غالب کے دور میں شخصیت اور شاعری دونوں کو سنوارنے کے سلسلے میں بڑا ریاض کرنا پڑتا تھا۔ غالب کو بالخصوص اس عمل سے گزرنا پڑا۔ جس طرح کی مغلق اور پیچیدہ شاعری سے انہوں نے ابتدا کی تھی اس سے بالکل مختلف نوعیت کی شاعری کیلئے انہیں اپنے آپکو تیار کرنا پڑا۔ انکے نابغہ ہونے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کیونکہ انہوں نے صورتحال کو پہچانا اور اپنی صلاحیت کو ایک نیا رنگ و رخ دے کر اتنی شاندار کامیابی حاصل کی۔ غالب شاعر ہونے کے اعتبار سے بے مثل، شخص کی حیثیت سے صلح پسند، عاقبت جو، بامروت، خیر منش وضع دار، طباع اور نفاست پسند تھے۔ دوستوں اور شاگردوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان سب کو کچھ دے دینا اور سکھادینا چاہتے تھے۔ انکے اطراف جس طرح کے لوگ جمع تھے اس سے انکی

انفرادیت میں اجتماعیت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

کالیداس گپتا رضا

تصانیف شیفتہ

ماہنامہ آجکل دہلی، نومبر ۱۹۸۶ء، جلد ۴۵ شمارہ ۴، ص ۵ - ۹

مضمون ہذا میں مندرجہ ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے:

(۱) دیوان ریختہ (۲) گلشن بے خار
(۳) برہ آورد (۴) دیوان و رقعات فارسی
(۵) کلیات شیفتہ و حسرتی

محمد حسین خان شفا

سرسید احمد خان کی ایک نادر نعت

ماہنامہ برہان دہلی، دسمبر ۱۹۸۶ء جلد ۹۴ شمارہ ۶، ص ۵۷ - ۶۰

تدبر قرآن کے دوران سرسید کی حیات بعد ممات، حشر اجساد، جزا و سزا وغیرہ ایسے عقاید پر غور کرنا پڑا جنکی معقول و عصری ذہن کے لئے قابل قبول تشریح سے سرسید کی عقل قاصر تھی۔ ان مسائل پر غور کرتے ہوئے سرسید پر استغراقی کیفیت طاری ہوئی اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ خود شارع اسلام ان مسائل کے رموز و نکات سرسید کو بتارہے ہیں۔ چونکہ سرسید کا خیال تھا کہ وہ پہلی مرتبہ غیبی اشارے سے ان مسائل کو حل کررہے ہیں اور انھیں اس اہم کام میں اپنے جد اعلیٰ محمد صلعم کی تائید حاصل ہے اس بنا پر اس بحث کے اختتام پر ہدیۂ تشکر کے بطور فی البدیہہ ایک فارسی نعت موزوں ہوگئی جس کو انھوں نے اسی بحث میں تحریر کردیا تاکہ یادگار رہے۔

یہ سرسید کی پہلی اور آخری نعت ہے جو تفسیر قرآن ہونے کا جزو ہونے کی وجہ سے عام نظروں سے ابھی تک اوجھل ہے اسے مع اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

تنویر احمد علوی

رسالہ صاحبیہ

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۸۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۲ ص ۳۳ - ۶۵

رسالہ صاحبیہ کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ مختصر رسالہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی تالیف ہے۔

رسالہ صاحبیہ کا سن تالیف 1051 ہجری ہے۔ اس میں شہزادی نے خود اپنے اور ملا صاحب کے وہی حالات لکھے ہیں جن سے شہزادی کی نظر میں بحثیت شیخ طریقت انکی زندگی کے خاص خاص گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس عہد

کی مغل تاریخ کے بعض اہم واقعات پر بھی اس رسالے سے کہیں کہیں روشنی پڑتی ہے۔

شہزادی کی تحریر میں قدیم انداز نگارش کی بہت سی جھلکیاں موجود ہیں باایں ہمہ بیشتر مواقع پر اسکی تحریر صاف سادہ اور سلیس ہے۔

۱۰۹۲ ھجری میں شہزادی نے دلی میں انتقال کیا۔

ابولکلام قاسمی

زیب غوری کی شاعری کا ایک
نمایاں پہلو

ماہنامہ کتاب نما دہلی، اکتوبر ۱۹۸۶ ع
جلد ۲۶ شمارہ ۱۰، ص ۵-۱۰

زیب غوری ایک ممتاز شاعر ہونے کے ساتھ اچھے مصور بھی تھے۔ جن لوگوں نے ان کی بنائی ہوئی تصویریں یا مناظر کی عکاسی دیکھی ہے ان کو اندازہ ہے کہ مصوری بھی انکے لئے جینوین اظہار کا ایسا ہی ذریعہ تھی جسطرح شاعری کا وسیلہ اگر کسی توانا اور طاقتور تخلیقی ہاتھوں میں آجائے تو یہ فن لطیف ایک ساتھ کم از کم تین فنون لطیفہ کی نمایندگی کرنے کا اہل نظر آنے لگتا ہے مضمون ہذا میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں صورت گری میں اور پیکر تراشی کے فن کو کس طرح روبہ عمل لاتے ہیں۔ ہر زبان اور ہر زمانے میں شاعری میں لفظی صورت گری، محاکات یا پیکر آفرینی کا اہم رول رہا ہے زیب غوری کا مطالعہ اگر آپ ان مفروضات کو بھول کر بھی کریں تو انکی پیکر تراشی آپ کے ذہن اور حسی تجربے کے کسی نہ کسی سلسلے کو ضرور متحرک کرے گی ان ان میں بصری اور سمعی پیکروں کی ایسی بہتات ہے کہ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے گویا یہ کائنات اور مظاہر فطرت شاعر پر عموماً ان ہی دو حواسوں کی مدد سے وارد ہوتے ہیں۔

گیان چند جین

شاہ میراں جی شمس العشاق اور
انکی نثری تصانیف

ششماہی نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۸٦ع
جلد ۳۶ شمارہ ۳۶، ص ۱-۴۲

افسوس یہ ہے کہ شمس العشاق جیسی درخشندہ ہستی کے حالات زندگی تاریکی میں ہیں۔ انکے نسب، تاریخ ولادت و تاریخ وفات سب پر اختلاف رائے ہے۔ دراصل

متضاد قدیمی بیانات کی وجہ سے یہ مسائل ایسے لاینحل بن گئے ہیں کہ قیاس کا سہارا لئے بغیر چارہ نہیں۔ کوئی دلیل ایسی مسکت نہیں جسے قول فیصل کہا جاسکے۔

ان تمام تضادات کو مد نظر رکھتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ شاہ میراں جی کی ولادت ۹۰۲ ہجری یا ۹۰۴ ہجری میں ہوئی اور وفات ۲۵ شوال ۹۹۴ ھجری شب پنج شنبہ میں۔ انکی کوئی مصدقہ نثری تصنیف دستیاب نہیں ہے۔ گو مندرجہ ذیل تصانیف ان سے منسوب ہیں:

(۱) جل ترنگ (۲) گل باس
(۳) شرح القلوب (۴) صب رس
(۵) سبع صفات

لیکن مقالہ نگار کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔

نظام الدین ایس گوریکر

افسر الشعرا سید محمود حسین افسر

ماہنامہ آجکل دہلی نومبر ۱۹۸۶ ع

جلد ۹۴ شمارہ ۴۴ ص ۱۷-۹۱

سید محمود متخلص افسر (۱۸۷۴ ع - ۱۹۴۸ ع) کا سلسلۂ نسب خواجہ قطب الدین مودود چشتی سے ملتا ہے۔ انکے آبا و اجداد بڑودہ آئے اور مہاراجگان سے سے اعزازات حاصل کئے۔

افسر مودودی نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزلگوئی اور نعت گوئی میں اپنا مقام بنایا۔ انکی شاعری میر، غالب اور فانی سے مختلف رنگ میں پائی جاتی ہے۔

انکے کلام میں آمد اور برجستگی اور زبان و بیان کی سادگی نے انکی شخصیت اور فن کو بہت بلنــــد کردیا ہے انکی رجائیت پسندی نے انہیں عزم و حوصلہ کے ساتھ توانائی عطا کی ہے۔

مجتبیٰ حسین

حضرت خواجہ حسن نظامی
کی خاکہ نگاری

ماہنامہ آجکل دہلی، نومبر ۱۹۸۶ ع

جلد ۴۵، شمارہ ۴، ص ۲۵-۲۷

خاکہ نگاری میں خواجہ صاحب کی دین ناقابل فراموش ہے وہ اردو کے اولین خاکہ نگار ہیں جنھوں نے روش عام سے ہٹ کر خاکے لکھے۔ پیرائے بیان خواجہ صاحب کی خصوصیت ہے اسکی وجہ سے انکے خاکوں میں جہاں گہرائی و گیرائی ہے وہیں شوخی و شرارت، چلبلا پن اور ظرافت ہے ان کے خاکوں میں بے تکلفی کی ایک ایسی فضا ہے جو ان سے پہلے

کسی خاکہ نگار کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

خواجہ صاحب کا سب سے بڑا ہتھیار انکی اچھوتی اور نرالی زبان ہے جسے انہوں نے امرا کے ایوانوں یا علما کے دیوان خانوں سے نہیں اٹھایا بلکہ سڑک سے اٹھایا ہے۔ بے ساختگی، لطافت اور روانی انکے اسلوب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جب وہ قلم برداشتہ کسی کا خاکہ لکھتے ہیں تو اپنی موہنی سی زبان کے ذریعے اس کردار کو نہ صرف چلاتے پھراتے ہیں بلکہ تقویت گویائی بھی عطا کرتے ہیں۔ جیسا کردار ہوتا ہے ویسی ہی زبان اسکا خاکہ لکھنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

نور الحسن ہاشمی

اردو میں ایک نادر روزنامچہ

ماہنامہ آجکل دہلی، اکتوبر ۸۶ع

جلد ۴۵ شمارہ ۳، ص ۴-۸

اردو میں روزنامچے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ اب تک جتنے بھی دستیاب ہوئے ہیں ان میں مولوی سید مظہر علی سندیلوی کا روزنامچہ جو قلمی صورت میں موجود ہے اولیت رکھتا ہے۔ یہ ۲۱ جنوری ۱۸٦۷ع سے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ع تک (مولوی صاحب کے یوم وفات) یعنی تقریباً ۴۵ سال تک بلا ناغہ لکھا گیا ہے۔

مولوی صاحب کا روزنامچہ کسی ادیب کا روزنامچہ نہیں ہے بلکہ ایک نہایت مصروف آدمی اور ایک نہایت مستما زمیندار کی ڈائری ہے لیکن چونکہ عربی فارسی و انگریزی میں لیاقت اچھی خاصی تھی اسلئے کہیں کہیں انکی تحریر میں ادبی رنگ آجاتا ہے اس روزنامچے کی اہمیت اسلئے ہے کہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دنیا کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جو انکے زمانے میں ہوا ہو اور اس میں مندرج نہ ہو۔

وہاب اشرفی

غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری

ماہنامہ آجکل دہلی، دسمبر ۱۹۸٦ع

جلد ۴۵، شمارہ ۵، ص ۹-۱۰

غیاث احمد گدی ایک چابکدست قصہ گو ہیں لہذا وہ اپنی کہانیوں کے قوام کو پوری فنکاری کے ساتھ گرفت میں رکھتے ہیں۔ جزئیات کا ایسا فنکارانہ بیان خال خال افسانہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔

انکی افسانوی تکنک کا ایک اور پہلو سچویشن اور کردار کو متضاد سمتوں میں رکھنا ہے انہوں نے الفاظ کی معنویت اور انکے تخلیقی برتاؤ پر بڑا زور دیا ہے عام طور پر انکا اظہار بیان استعارانی

ہوتا ہے۔

مذہبیات

غلام یحییٰ انجم

ملا صدرا کا رسالہ «وحدت الوجود»
ایک تعارف

ماہنامہ برہان دہلی، نومبر ۱۹۸٦ ع
جلد ۹۴ شمارہ ۵ ص ۳۸-۵۲

ملا صــــدرا کا مکاشفہ اور وجدان و عرفان کے معاملے میں کوئی ہم سر نہیں چنانچہ انکی عبقریت کے اعتراف میں قوم نے انہیں صدر المحققین کا خطاب دیا ہے۔

اس جلیل القدر شخصیت کی سن ولادت تقریباً ۹۸۰ ہجری ہے کیونکہ انہوں نے ۱۰۵۰ ہجری میں ساتویں بار حج سے واپسی میں ستر سال کی عمر پاکر وفات پائی۔

انہوں نے اپنے وقت عزیز کا بیشتر حصہ درس و افادہ کے علاوہ کتب و رسائل کی تصنیف میں بھی صرف کیا جنکی تعداد ۳۳ بتلائی جاتی ہے۔ ان میں شرح ہدایۃ الحکمۃ «صــــدرا» کے نام سے مدارس عربیہ کے نصاب میں مشمول ہے۔

نظریہ وحدت الوجود کے اثبات میں مصنف نے عقلی و برہانی دلائل بھی دئیے ہیں اور اس عقیدہ کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے قرآنی شواہد سے استشہاد کیا ہے:

محمد عبدالشہید نعمانی

یمن میں اشاعت اسلام کی ابتدا
(آنحضرتؐ کے مکتوبات کی روشنی میں)

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۸۷ع
جلد ۱۳۹، شمارہ ۱ ص ۲۸-۴۸

جہاں تک یمن میں دعوت اسلامی کا تعلق ہے تو اسکا آغاز آنحضرتؐ کی بعثت کے متصل ہی ہوگیا تھا۔ آنحضرتؐ نے انکی دانائی، حکمت اور ایمان کی تعریف فرمائی ہے۔

چنانچہ آنحضرتؐ نے جب دعوت اسلامی کے سلسلے میں خطوط ارسال فرمائے تو ملوک حمیر کے نام بھی متعدد خطوط بھیجے۔

محمد مصطفیٰ الاعظمی
ترجمہ حافظ محمد عبدالصدیق ندوی

شاخت اور حدیث نبوی

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۸٦ ع
جلد ۱۳۸ شمارہ ۵ ص ۳۲۵-۳۴۸
دسمبر ۱۹۸٦ ع جلد ۱۳۸ شمارہ ٦،
ص ۴۰۵-۴۲۰

جنوری ۱۹۸۷ع جلد ۱۳۸ شمارہ ۷
ص ۵-۲۷

شاخت کی تقریباً ہر تحریر میں خیالات کا مرکزی اور بنیادی نظریہ یہی کارفرما ہے کہ فقہ یا قانون یا شریعت کا موجودہ ذخیرہ دین کے دائرہ سے خارج ہے اور نبی کریمؐ نے اسکو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اس طرح صحابہ اور تابعین جیسے اولین مسلمانوں نے اس سے اعتنا نہیں کیا تو اس میدان میں زیادہ اہتمام کی ضرورت ہی نہیں ہے ۔

شاخت کے مذکورہ بالا دعوؤں میں فاضل مقالہ نگار کی رائے میں تجزیہ کرتے وقت دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ۔

اول تو انہوں نے اپنے مطالعہ میں عقلی و منطقی طرز فکر کو راہ نہیں دی ۔

دوسرے یہ کہ اپنے نظریہ کو ثابت کرنے میں انہوں نے اسلام کے مصدر اول قرآن مجید سے اعتناء نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرآن مجید کی پیش کردہ حقیقتوں سے لاعلم رہے ۔

اسیر ادروی

امام ابوذرعہ رازی

ماہنامہ برھان دہلی ، اکتوبر ۱۹۸۶ع
جلد ۳۴ شمارہ ۴ ص ۲۸-۴۳
نومبر ۱۹۸۶ع جلد ۹۸ شمارہ ۵ ص ۲۴-۴۱

معرفۃ صحابہ میں ابوذرعہ کا علم بڑا وسیع تھا صحابہ کی عظمت و فضیلت اور مقام و مرتبہ کے سلسلے میں وہ بہت ہی متشدد تھے ۔

کتاب الصحابہ ابوزرعہ کی ایک محققانہ کتاب ہے کتاب میں صحابہ کرام کے مقام و مرتبہ کے علاوہ انکی تعداد صحابی اور تابعی میں اشتباہات کو بڑی دیدہ وری اور تحقیق سے دور کیا گیا ہے ۔

اسکے علاوہ اجوبۃ ابی زرعۃ علی اسئلۃ الرذعی ، التفسیر ، کتاب الجرح و التعدیل ، بیان خطا النجاری فی تاریخہ ، کتاب فوائد الرازنیین ، کتاب الفوائد ، کتاب الفضائل اور اعلام النبوۃ یا دلائل النبوۃ بھی انکی تصنیفات ہیں ۔

محمد صلاح الدین عمری

تنبیہ الغفول

ماہنامہ برہان دہلی ستمبر ۱۹۸۶ع
جلد ۹۴ شمارہ ٦ ، ص ۳۰-۳٦

تنبیہ الغفول فی اثبات اسلام آباء الرسول کے مصنف قاضی ارتضا علی خاں خوشنود انیسویں صدی کے متبحر عالم اور باذوق

فارسی و عربی کے شاعر ہیں۔

قاضی صاحب کی پیدائش قصبہ گوپا مئو (ضلع ہردوئی اودھ) کے ایک علمی گھرانے خاندان فاروقیان میں ۱۱۹۸ ہجری مطابق ۱۷۸۳ ع میں ہوئی۔

قاضی صاحب کی مستقل علمی تصانیف کی ہیں۔ تنبیہ الغفول بھی مخطوطہ کی شکل میں کتب خانۂ فاروقی میں موجود ہے۔ اسکا اصل نسخہ تو فارسی زبان میں ہے لیکن اسکا ایک عربی ترجمہ بھی اسی نام سے کتب خانہ میں ہے۔

کتاب میں آبا و رسول کے اسلام کے بارے میں مدلل بحث کی گئی ہے آخر میں آنحضرتؐ کا شجرۂ نسب بھی حضرت آدم تک مرتب کیا گیا ہے۔

نورالحسن راشد کاندھلوی

حضرت گنگوہی کے ایک گمنام شاگرد
اور خلیفہ مجاز

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، فروری ۱۹۸۷ع
جلد ۵۵، شمارہ ۲، ص ۲۸-۳

اس قسط (نمبر ۲) میں مولانا صدیق احمد کاندھلوی کے سلوک و تربیت اور اجازت و خلافت، مشاغل زندگانی کے ساتھ ساتھ مزاجی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

عبدالرحمٰن مومن

امام ابوحنیفہ اور عقیدہ خلق قرآن

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۸۷ع
جلد ۱۳۹، شمارہ ۱، ص ۴۹-۵۹

ڈاکٹر ضیا الحق صاحب نے امام ابوحنیفہ پر یہ بے بنیاد الزام عائد کیا ہے کہ وہ خلق قرآن کا عقید رکھتے تھے۔

حالانکہ امام صاحب اور انکے ممتاز تلامذہ کی تالیفات سے واضح ہوتا ہے کہ نہ تو امام صاحب اس عقیدہ کے قائل تھے اور نہ انکے شاگرد۔ حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کے معاندین اور حاسدین نے قصداً اور شرارتاً یہ عقیدہ امام صاحب سے منسوب کیا، اس امر پر بہت سارے اہل علم کی شہادتیں موجود ہیں۔

محمد رضی الاسلام ندوی

صحابہ کرام کی تحصیل حدیث
کی کیفیات

ماہنامہ برہان دہلی، اکتوبر ۱۹۸۶ع
جلد ۹۸ شمارہ ۴، ص ۹-۲۷
نومبر ۱۹۸۶ع جلد ۹۸ شمارہ ۵ ص ۹-۲۳

حضرات صحابہ کا معمول تھا کہ جو احادیث وہ رسول اکرمؐ کی مجلس میں سنتے تھے وہاں سے اٹھنے کے بعد آپس

میں مذاکرہ کرلیتے تھے تاکہ کسی کو اگر ٹھیک سے یاد نہ ہو تو پختہ ہوجائے۔

صحـــابہ کرام اپنی معـــاش و دیگر مصروفیات کے باوجود رسول اکرمؐ کی مجلسوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہونے کوشش کرتے تھے ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے آپؐ کی ملازمت اختیار کرلی تھی، ہر وقت ہر جگہ آپؐ کے ساتھ رہتی تھی اور جسکا کا کام ہی یہ تھـــا کہ آپؐ کی صحبت میں رہ کر قرآن و حدیث حاصل کرے اور دوسروں تک پہنچائیں۔

جو صحابہ روزانہ حاضر نہ ہوسکتے تھے انہوں نے آپس میں باری مقرر کرلی تھی۔ جو صحابہ بہت دور رہتے تھے وہ وقتاً فوقتاً اپنے وفود اور نمائنـــدوں کو بارگاہ رسالت میں بھیجتے تھے۔ اس طرح کوئی اگر دور رہتا اور اسے اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی اشـــکال ہوتا وہ فوراً مدینہ طیبہ روانہ ہوجاتا۔ ▬

شخصیـات

عبدالعزیز خان

برار کے مایہ ناز مورخ سید امجد حسین خطیب اچلپوری

ماہنامہ شاداب حیدر آباد فروری ۱۹۸۷ع جلد ۴ شمارہ ۲ ص ۱۳ - ۱۶

سید امجد حسین خطیب بمقام اچلپور ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے آپ کا اســم مبارک ابو الفتح ضیاء الدین محمد عرف امجد حسین خطیب اور امجد تخلص، خان بہادر کا خطاب سرکار انگریز سے عطا ہوا تھا۔

اردو فارسی اور عربی جانتے تھے۔ نظم و نثر دونوں پر مہارت رکھتے تھے۔ آپ کا دیوان «دیوان امجد فی مدح احمد» کے نام سے موسوم ہے۔ عالمانہ مضامین «شحنۂ ہند» کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ آپ نے تاریخ برار تصنیف کی جو تاریخ دکن یہ ریاض الرحمن مشہور بہ تاریخ امجدی ہے۔ یہ مصنف کی فارسی تصنیف ہے۔ موصوف کے فارسی تصنیف کا اردو میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے جسے اہل علم نے «چراغ برار» کہا اور خطیب صاحب کو «آفتاب برار» کا خطاب عطا کیا۔

تاریخ امجدیہ گیارہ ابواب اور ایک خاتمہ (مشتمل برسہ فصل) کا مجموعہ ہے۔

سرزمین برار کا یہ درخشندہ ستارہ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۵ع کو سدا کیلئے غروب

ہوگیا۔ آپکی خواہش کی مطابق حضرت عبدالرحمن غازی کی درگاہ شریف میں نوبت والوں کی نشست کے مقابل دفن کیا گیا۔

خواجہ احمد فاروقی

مولانا محمد علی

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۸۶ع
جلد ۱۳۸ شمارہ ۵ ص ۳۸۱ - ۳۹۱

مولانا محمد علی کے انتقال پر ایچ جی ویلز نے جو انگلستان کا بڑا ادیب اور مورخ تھا لکھا تھا۔ کہ « محمد علی کا دل نپولین کا تھا، قلم میکالے کا تھا اور زبان یا خطابت برک کی سی تھی» یہ بات صحیح ہے کہ ان میں اور نپولین میں بہت مشابہت تھی۔ نپولین بھی ناکام رہا اور محمد علی بھی ناکام رہے۔

اسکے باوجود مولانا محمد علی کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ع کی بغاوت کے بعد پہلی سب سے بڑی عوامی تحریک کی قیادت کی جس میں انہوں نے ایک کروڑ والنٹیرز دئیے۔ اپنی شعلہ بیانی سے تمام ملک میں آگ لگادی۔ سرفروشوں کی ایک بڑی جماعت کھڑی کردی اور ہندو مسلم اتحاد کے وہ نظارے پیش کئے جو چشم فلک نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔

مظفر گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانی
حیات اور شخصیت

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، نومبر دسمبر ۱۹۸۶ع
جلد ۵۴ شمارہ ۱۲-۱۱ ص ۶۵-۷۶

مولانا کی ذاتی زندگی بے مثال تھی، عثمانیہ یونیورسٹی میں قریب ۲۸ سال تک دینیات کے پروفیسر رہے صدر شعبہ رہے۔ اس حیثیت سے بڑی معقول تنخواہ پاتے رہے لیکن زندگی ہمیشہ فقیرانہ رہی اس فقیری نے ان میں ایک افتخار اور شان امارت پیدا کردی تھی۔

اپنے ہمعصروں میں مولانا محمد علی ڈاکٹر اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی مولانا عبدالماجد دریا بادی اور مولانا منظور نعمانی سب سے زیادہ متاثر تھے۔ شاعری سے کبھی تعلق نہ رہا لیکن جب کبھی جذبات سے مغلوب ہوجاتے تو شعر کہنے سے باز نہیں رہتے۔

مولانا کی تصانیف کا شمار آسان نہیں ہے، ہر تصنیف بلند علمی و تحقیقی معیار کی ہے اور عجیب و غریب ادبی چھاشی

لئے ہوئے خصوصاً النبی الخاتم، ابوذر غفاری، ابن القیمہ، تدوین قرآن، تدوین حدیث، مقالات احسانی، اسلامی معاشیات امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، نظام تعلیم و تربیت، سوانح قاسمی، تفسیر سورہ کہف اور ظہور نور کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انکے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں۔ انکی لوح پر «لحد پاک مناظر احسن» کندہ ہے۔ جس میں مناظر احسن تاریخ پیدائش ہے اور تاریخ وفات کیلئے لحد پاک کا اضافہ کردیا ہے۔

متفرقات

اسرار اشفاق

طبقہ امرا کی گھریلو بول چال میں مستعمل انگریزی الفاظ

ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد پاکستان
نومبر ۸۶ع جلد ۳ شمارہ ۱۱ ص ۴-۱۱
دسمبر ۸۶ع جلد ۳ شمارہ ۱۲ ص ۱۵-۲۰
فروری ۸۷ع جلد ۴ شمارہ ۲ ص ۱۸-۲۴

اس فہرست میں ان الفاظ کی نشاندہی کی ہے جو طبقۂ امرا میں گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں اور اردو کے ساتھ بڑی روانی سے بولے جاتے ہیں۔

سید جمیل احمد رضوی

پروفیسر سید عبداللہ مرحوم منتخب کتابیات

ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد پاکستان جنوری ۱۹۸۷ع جلد ۴ شمارہ ۱ ص ؟

ڈاکٹر سید عبداللہ (۵ اپریل ۱۹۰۶ع - ۱۴ اگست ۱۹۸۶ع) کی وفات سے علم و ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا جس کا پُر ہونا آسان نہیں۔ انکی کتابوں اور مقالات کی فہرست بہت طویل ہے۔ اسکا ذکر انہوں نے اپنے شخصی کوائف نامہ (شائع کردہ ادارہ خیابان ادب لاہور ۱۹۸۲ع) میں کیا ہے۔ اس کے مطابق اردو میں لکھے گئے مقالات کی تعداد تین سو سے زیادہ بنتی ہے انگریزی مضامین اور مقالات کی تعداد ایکسو دو ہے۔

سید محمد ضیا الدین شمسی طہرانی

عربی ادب میں ہندوستانی فضا

ماہنامہ برہان دہلی نومبر ۱۹۸۶ع جلد ۹۴ شمارہ ۵ ص ۳۲ - ۳۷
دسمبر ۱۹۸۶ع جلد ۹۴ شمارہ ۶ ص ۲۴ - ۲۹

عرب و ہند کے تعلقات کا سلسلہ ماقبل

تاریخ کے عہد سے ملتا ہے۔ ان تجارتی تعلقات ہی کا نتیجہ تھا کہ عرب میں قدیم زمانے سے ہندوستان کی بہت سی چیزیں کثرت سے استعمال ہوتی تھیں۔ اس کا اندازہ عرب شعرا کے کلام سے بھی ہوتا ہے جنھوں نے اشعار میں ہندوستان کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے اس ذکر سے عربی ادب میں ہندوستانی فضا کا تصور ابھرنے لگتا ہے۔

جیسے ہندی تلوار، ہندی نیزے، مشک عود، کافور، زنجبیل، فلفل، ساج، قسط دادی (تاڑی) وغیرہ وغیرہ

نظام الدین ایس گوریکر

بمبئی یونیورسٹی میں اردو میں
تحقیقاتی مقالے

ہماری زبان ہفتہ وار دہلی ۲۲ نومبر ۱۹۸۶ع ص ۸

پروفیسر گوریکر صاحب نے بمبئی یونیورسٹی میں اردو میں تحقیق سے متعلق سرسری طور پر جائزہ لیا ہے اور بمبئی یونیورسٹی میں تاحال جو مقالے پی ایچ ڈی کے لئے قبول کئے گئے ہیں انکا ذکر کیا ہے۔

●

●

Edited by Dr Nizamuddin S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director, Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Mr Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary, Anjuman-i-Islam, Bombay 400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400008

مقالہ نما ذیل کے رسائل سے ترتیب دیا گیا ہے

المعارف — ماہ نامہ
(مدیر : محمد سعید شیخ)
ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

الفرقان — ماہ نامہ
(مدیر : محمد منظور نعمانی)
۳۱، نیا گاؤں (مغربی) لکھنؤ

معارف — ماہ نامہ
(مدیر : سید صلاح الدین عبد الرحمن)
دار المصنفین، اعظم گڑھ (یو پی)

برہان — ماہ نامہ
(مدیر : سعید احمد اکبرآبادی)
اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

سب رس — ماہ نامہ
(مدیر : مغنی تبسم)
ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو
حیدرآباد (آندھرا)

الفاظ — دوماہی
(مدیر : احمد سعید خان)
ایجوکیشنل بک ہاؤس یونیورسٹی مارکیٹ علیگڑھ

فکر و نظر — ماہ نامہ
(مدیر : ساجد الرحمٰن)
ادارۂ تحقیقات اسلامی،
اسلام آباد (پاکستان)

ہماری زبان - ہفتہ وار
(مدیر : خلیق انجم)
انجمن ترقی اردو (ہند)، راؤز ایوینیو، نئی دہلی - ۲

شاعر — ماہ نامہ
(مدیر : افتخار امام صدیقی)
مکتبہ قصر الادب، بمبئی ۸

کتاب نما — ماہ نامہ
(مدیر : شاہد علی خاں)
مکتبہ جامعہ اسلامیہ، جامعہ نگر، دہلی ۲۵

جامعہ — ماہ نامہ
(مدیر : ضیاء الحسن فاروقی)
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

نوائے ادب - ششماہی
(مدیر : نظام الدین ایس گوریکر)
انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱

شب خون — ماہ نامہ
(مدیرہ : عقیلہ شاہین)
۳۱۳، رانی منڈی، الہ آباد

تہذیب الاخلاق — پندرہ روزہ
(مدیر : اسرار احمد)
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (یوپی)

قومی راج — پندرہ روزہ
(مدیر : ریاض احمد خان)
جرنل انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
سچیوالیہ بمبئی ۳

خدا بخش لائبریری جرنل — سہ ماہی
خدا بخش لائبریری پٹنہ (بہار)

●

رسائل کے مدیروں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنے رسائل و جرائد نوائے ادب میں مقالہ نما کی ترتیب کے لئے ڈائرکٹر کے نام بھیجیں۔ (ادارہ)

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

لغات گجری (مرتبہ)
رقعات عالمگیر (مرتبہ)
مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
سوراج (ترجمہ)
رہنمائے صحت (ترجمہ)
ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی

ولی گجراتی (مولفہ)
نورالمعرفت (مرتبہ)
غزل ولی تک (مولفہ)
اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
نوائے وقت (مولفہ)
گلمپسز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
طوطیان ہند (مرتبہ)
انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)

عبدالرزاق قریشی

نوائے آزادی (مرتبہ)
مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
مبادیات تحقیق (مولفہ)
راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری
مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
مقالہ نما مرتبہ رقیہ انعامدار

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۳۷ — شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۸۷ء

مندرجات

FORM : IV - ROLL NO : VIII

نوائے ادب، بمبئی

Registration No. 32009/50 — رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نوعیت اشاعت : ششماہی

نام پرنٹر : جناب عبدالمجید پالکا، بی، کام (آنرز)

قومیت : ہندوستانی

پتــہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پبلشر، قومیت، پتــہ : ایضاً

نام ایڈیٹر : پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

قومیت : ہندوستانی

پتــہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پتہ مالک رسالہ : ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

• • •

All remittances be sent& correspondence be made to
Prof. N. S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

Annual Subscription
Inland : Rupees Twenty-five • Foreign : Pound Five

احوال واقعی

انجمن اسلام :

علمی و ادبی اور تعلیمی و ثقافتی حلقہ میں اس بات کا اعلان کرنے میں مسرت ہورہی ہے کہ مرکزی حکومت ہند نے انجمن اسلام بمبئی کو نہ صرف مسلم اقلیتی ادارہ بلکہ مغربی ہندوستان کا نمائندہ تعلیمی ادارہ تسلیم کیا ہے۔ صدر انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب اور انکے تمام ساتھی قابل مبارکباد ہیں۔

سال گذشتہ کی صد سالہ تقریبات کی شاندار کامیابی کا جایزہ لیتے ہوئے انجمن اسلام نے آئندہ کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا مصمم ارادہ کیا ہے۔ اس تعلق سے اردو تربیتی دانشگاہ کے سلسلے میں حکومت مہاراشٹرہ کے شعبۂ تعلیم سے سلسلۂ جنبانی شروع کردی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ آئندہ تعلیمی سال سے اس تربیتی کالج کا افتتاح عمل میں آجائیگا جو قوم و ملک کے لئے فال نیک ثابت ہوگا۔

مسرت کا مقام ہے کہ انجمن اسلام کے عہدیداران اور اراکین کیریئر کورسیز کے تربیتی مراکز کے قیام کے سلسلے میں سرگرم عمل ہیں اور انشاء اللہ انجمن اسلام کے زیر اہتمام علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرز پر بہت جلد ان تربیتی مراکز کے جاری ہونے کے قوی امکانات ہیں۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ :

انجمن اسلام نے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام جلد ہی سرٹیفکٹ اور ڈپلوما صحافتی اور لائبریرین جزوقتی کورسیز بذریعہ اردو جاری کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ اس ضمن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے رابطہ قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

کل ہند اخبار :

ستمبر کے اواخر میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب

سید حامد صاحب نے انجمن اسلام اکبر پیر بھائی آڈیٹوریم میں کل ہند سطح پر ایک اخبار کے اجراء پر زور دیا اور فرمایا کہ مسلم کاز کو تقویت دینے کے لئے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں ہے اور کل ہند اخبار کے ذریعے ہی ہم اپنے مسائل کا حل تلاش کرسکتے ہیں. یہ جلسہ ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی ایما پر طلب کیا گیا تھا جس میں جناب عبدالرحمٰن انتولے صاحب، جناب مصطفیٰ فقیہ صاحب جناب صدر الدین ضیاء صاحب، جناب یوسف خان صاحب اور دیگر ممتاز اور نامور صحافیوں نے شرکت کی. اور پر زور الفاظ میں تائید کی حاضرین میں ہر مکتب خیال کے افراد شریک تھے

نئی تعلیمی پالیسی .

نئی تعلیمی پالیسی کے پیش نظر نئے نصابات کے تعلق سے غور و خوض کرنے کی غرض سے صدر انجمن اسلام ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے ایک مخصوص نشست کا اہتمام انجمن اسلام کے ہال میں اکتوبر کے اوائل میں کیا 'بمبئی عظمیٰ' کے ابتدائی اور ثانوی اردو مدارس کے صدر مدرسین اور معاونین کے علاوہ تعلیمی محکمہ سے وابستہ افسران میں صدیقی صاحب اور قلمدار صاحب کے علاوہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر کوریکر صاحب اور انجمن اسلام کے عہدیداران میں ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب، جناب پالکا صاحب، جناب زری والا صاحب اور اساتذۂ کرام میں جناب موتلیکر صاحب، جناب راقی صاحب، جناب لوکھنڈ والا صاحب، محترمہ رشیدہ قاضی صاحبہ، محترمہ صدیقہ انکولکر صاحبہ، محترمہ نسیم بیکری والا صاحبہ، محترمہ عزیزہ بخشی صاحبہ وغیرہ نے بحث و مباحثہ میں حصہ لیا. یہ نشست ہر لحاظ سے مفید اور دلچسپ تھی.

آخر میں شرکائے جلسہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے صدر جلسہ ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب سے درخواست کی کہ وہ حکومت مہاراشٹر کو مجوزہ نصابات کے تعلق سے اپنے شکوک کی طرف توجہ دلائے اور خیالات و آرا سے آگاہ کردے تاکہ نصابات کی آخری شکل میں ان تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہوجائے.

مدیر

جناب کنول ڈبائیوی
بسم اللہ لاج، چھوٹی مسجد
جمالپور - علی گڑھ (یوپی)

اردو کے غنائیہ ڈرامے: سوانگ یا نوٹنکی

(۲)

ڈرامہ پارٹی کے پاس سامان مختصر ہوتا ہے۔ مردانہ لباس کی تو بات یہ ہے کہ صافہ کپڑے مانگے کی شیروانی اور کوٹ سے کام چلا ہی لیا جاتا تھا۔ مگر زنانہ لباس میں عام طور پر ساڑی یا شلوار کے سوٹ کام میں لائے جاتے تھے۔ ڈرامے کا پارٹ اسلامی ہونے کی وجہ سے زنانہ سوٹ میرے یہاں سے مانگا گیا۔ پونے دس بجے ہارمنیم ماسٹر نے ہارمنیم بجانا شروع کردیا۔ اور اداکار بھی اسٹیج پر آنا شروع ہوگئے تھے۔ اور نقّارچی کے پاس ہی بیٹھتے گئے۔ منڈلی کے استاد بھی آکر بیٹھ گئے۔ ڈرامہ شروع کرنے کیلئے ہر اداکار نے استاد سے اجازت لی۔ اور پھر کھیل کا منگلا چرن (حمد) شروع کیگئی جسمیں سبھی ایکٹر شامل تھے۔ اسکے بعد ہی ڈرامہ شروع ہوگیا۔ اسوقت غزلوں قوالیوں وغیرہ کیلئے گاؤں کے لوگوں کی فرمائش کا رواج نہ تھا۔ بلکہ ہوتا یہ تھا کہ ڈرامے میں ہی موقع کے اعتبار اور مناسبت کا خیال کرتے ہوئے موقع بہ موقع غزل، قوالی، مثنوی، مسدس، راگ، راگنی گیت وغیرہ استاد کی ترتیب کے تحت انجام پاتے رہتے جس سے ڈرامہ کے سنگیت اور تغزّل میں جان پڑتی رہتی تھی۔ اسطرح ڈرامہ رات بھر ہوتا رہتا۔ لوگ محویت اور دلچسپی سے دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھی اچھے اشعار پر یا اچھی اداکاری پر یا کسی فنی مظاہرے پر خوش ہوکر عام پبلک کی طرف سے ایک روپیہ لئے ہوئے جگہ جگہ سے ہاتھ اٹھتے تھے جسے اداکار خود جاکر وصول کرتا۔ اور اسٹیج پر آکر روپیہ دینے والوں کے نام کا اعلان کرنے کے بعد شکریہ اداکرتا تھا۔ محفل میں کسی طرح کا شور و غل یا بدنظمی دیکھنے یا سننے کو نہیں ملتی تھی۔ اس ڈرامے کیلئے آجکل کی طرح کسی اجازت سرکاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

کیونکہ ڈرامہ کا انتظام گاؤں کے .اوقار لوگونکے ہاتھ میں ہوتا تھا. ڈرامہ شروع سے ہی اتنے اچھے طریقے اور دلکش انداز سے چلا کہ لوگوں کے آنسو نکل نکل آئے . کافی روپئے انعام میں آئے . یاسین کانپوری جیسے ماہر کہنہ مشق شاعر کے قلم کا نکلا ہوا ڈراما میں ہر لفظ میں روح لطافت ہر شعر جذبات سے بھرپور . میں آئندہ کبھی یاسین کے غنائیہ ڈراموں کے بارے میں لکھونگا تو آپ آغا حشر اور دوسرے ڈرامہ نگاروں کو بھول جائیں گے . معاشی مجبوری نے انہیں ملازمت کرنے پر مجبور کردیا اور انہیں اپنے فن کو دوسروں کیلئے وقف کردینا پڑا کبھی نام اور شہرت کا خیال نہیں کیا زیادہ تر شعراء نے سوانگ کے اختتام پر اپنے نام اور تخلص لکھے . لیکن انہیں کبھی اسکی پرواہ نہیں ہوئی . دو چار ڈراموں میں اتفاق سے نام آگیا کیونکہ ڈرامے پیسے سے مول لئے گئے تھے . اس میں اکثر پبلیشر اور مالک کمپنیوں نے ارادتاً زیادہ مشہور ڈراموں میں سے انکے ناموں کی جگہ اپنے نام یا تخلص درج کرادئیے ہیں . جو بھرتی کے ہونے کی وجہ سے صاف ظاہر ہوتے ہیں . پھر پھر ابھی تو ایسے لوگ موجود ہیں جن سے اس سلسلے میں میں نے تفتیش بھی کیں تو یاسین صاحب کے ان ڈراموں کا پتا چلا جن میں شری کرشن پہلوان نے اپنے نام و تخلص بھر دئیے ہیں . اس ڈرامے میں یاسین نے غزل، قوالی، بحر شکستہ مستزاد سب میں شاعری کی ہے . جس مستزاد سے لوگوں کے دل ہل گئے اور آنسو بہنے لگے تھے . میں اب بھی تنہائی میں اسے گنگنا لیتا ہوں . وہ سین بھی دردناک ہے جب فیروز اور شمسہ کی محبت کا راز کھل جاتا ہے اور شاہ فضل اور سپہ سالار طغرل شمسہ پر سختیاں کرتے ہیں . اور فیروز کی محبت کو ترک کرنے پر مجبور کرتے ہیں . لیکن وہ اپنی محبت پر ثبات قدم رہتے ہوئے ہر ظلم کو صبر و شکر کے ساتھ سہتی ہے . ان دونوں مفسدوں نے شمسہ کو پابہ زنجیر کرکے بیچ شہر میں بٹھادیا اور چاروں طرف پہرہ بٹھادیا اور منادی کرادی کہ کوئی شمسہ اور فیروز کو دانہ اور پانی نہ دے . اور پھر کئی دن گزر گئے . فیروز کو اپنی تو فکر نہ تھی مگر شمسہ کیلئے گھر گھر کھانا اور پانی مانگتا پھرتا تھا لیکن کسی نے خوف حکم شاہی کی وجہ سے رحم نہ کھایا اور شمشہ کی بھوک اور پیاس سے حالت غیر ہوئی یہاں تک کہ وہ لب دم ہوگئی مجبور ہوکر فیروز شمسہ کی جان بچانے

کیلئے تغرل سے بھی کھانے اور پانی کی بھیک مانگتا ہے اور رحم کی درخواست کرتا ہے۔ یہ سین ایک درد انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے جو پڑھنے کے بجائے دیکھنے اور سننے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ وہ مستزاد ملاحظہ فرمائیے :

فیروز مالی :-

اے شاہ وقت رحم کر پانی پلا پلا — پانی پلا پلا پانی پلا پلا
دم ٹوٹ رہا پیاس سے اب خشک ہے گلا — پانی پلا پلا پانی پلا پلا

طغرل :-

زندہ کھڑا ہے میرے جلانے کو برملا — یہ تیرا حوصلہ یہ تیرا حوصلہ
مارونگا تجھے ٹھہر تو پیاسا رلا رلا پیاسا رلا رلا — پیاسا رلا رلا پیاسا رلا رلا

فیروز :-

دشمن اگر جو میں ہوں تو حاضر ہے یہ گلا — تیغ دو دم چلا تیغ دو دم چلا
صدقے میں اپنے عیش کے شمسہ کو لے چلا — پانی پلا پلا پانی پلا پلا

طغرل :-

اس نابکار و زن کا زباں پہ نہ نام لا — دل اس سے ہے جلا دل اس سے ہے جلا
مارونگا یونہی اس کو بھی پیاسی رلا رلا — پیاسی رلا رلا پیاسی رلا رلا

فیروز مالی :-

صدقہ دے پانی پیاسے شہیدان کربلا — ہوگا تیرا بھلا ہوگا تیرا بھلا
پیاسی وہ مررہی ہے ذرا خوفِ خدا لا — اللہ جلا جلا اللہ جلا جلا

طغرل :-

مغرور مل رہا ہے محبت کا یہ صلہ — اسمیں ہے کیا گلا اسمیں ہے کیا گلا
طغرل تمہارے حق میں مصیبت کی ہے بلا — دے خاک میں ملا، دے خاک میں ملا
مارونگا تجھے ٹھہر تو، پیاسا رلا رلا — پیاسا رلا رلا - پیاسا رلا رلا

فیروز مالی ڈرامہ :-

اے خدا اے خدا تو کہاں سورہا ہے — دیکھ تیرے بندوں پہ کیا ظلم ہورہا ہے

شعر :-

ارے او عشق کے دیوتا ترے در کا پجاری ہوں
فقط تھوڑے سے کھانے اور پانی کا بھکاری ہوں

طغرل ۔ ٹھوکر مار کر :-

تجھے حونے کی ٹھوکر بھیک میں دیتا ہوں ،فرزانہ
یہ ہے تحفہ محبت کا اسے شمسہ کو دکھلانا[1]

طوالت کی وجہ سے اور مکالمے نہیں لکھ رہا ہوں نہیں تو آپ آغا حشر کے مکالموں کو بھول جائیں گے۔ انشا اللہ اپنی موجودہ مصروفیت ختم ہونے کے بعد اس موضوع پر بھی ایک مضمون پیش کرونگا حرابی یہ ہے کہ محمد یاسین کے ڈرامے اب بہت کم ملتے ہیں۔ صرف تھیٹر کمپنیوں کی ملکیت ہیں۔

شری کرشن کھتری کے زمانے میں نوٹنکی ڈراموں پر کے رنگ میں مغربی ڈراموں کا اثر کافی آچکا تھا۔ سوانگ میں کومک بھی بڑھا دیا گیا اور نثری مکالمے بھی کافی شامل کردئیے گئے مگلاچرن یا کورس کو حمد کی شکل میں دیا گیا ہے جیسی کہ نثری ڈراموں میں دی جاتی ہے۔

کورس آغا حشر کے ڈراموں کی طرح :- بلہاری اے باری تیرو کل جگ لیت نام غفّار — تو ہی کریم تو ہی رحیم کردگار ہی خلق، فلک تیری جھلک کل پر قادر — بلہاری مولا تیرے بلہاری قدرت کی گل کاری تو جل میں تو تھل میں جگت جوت جگمگات ستّار — بلہاری

رنگا :- دوہا

فارس ہے فردوس کی بہتر ایک نظیر
حسن و جمال و تہذیب کی ہے گویا جاگیر

چوبولہ :-

اس ملک کے لوگ غالباً پرستان والے ہیں
پری جمال بے مثال ماہرو سانچے میں ڈھالے ہیں

۱- ص ۴۰ - ۴۱ سانگیت ناٹک فیروز مالی از یاسین کانپوری مطبوعہ سری کرشن بکڈپو کانپور

شوخی ادا خاص ہے فطرتاً نازوں کے پالے ہیں
جنکی تیر نظر نے بسمل لاکھوں کرڈالے ہیں

کڑا یا غزل :-

عجب خطّہ تھا فارس کا خدا کی دستکاری تھی
عجب تھی سرزمین وہ اور عجب باد بہاری تھی
معّزز شائقین یہ اس زمانے کا ہے افسانہ
حکومت شاہ افضل جن دنوں فارس میں جاری تھی
ضرورت سے سوا زر سے تھی حاصل فارغ البالی
رسالہ توپ خانہ حسب خواہش فوج بھاری تھی
یہ سب ہوتے ہوئے محروم تھا فرزند سے افضل
جہاں میں سلطنت جسکے سبب بیکار ساری تھی
مگر ہاں ایک دختر نیک اختر ماہ رو گھر تھی
پدر تھا جسپہ قرباں اور ماں سو جاں سے واری تھی
مجسم حسن کی تصویر تھی صنعت تھی قدرت کی
حسینان جہاں کو جسکے آگے شرمساری تھی
زمانہ کمسنی کا ہوچکا تھا ایکدم رخصت
جوانی جوش پر تھی حسن کی فصل بہاری تھی
پسند تھی دل کو آزادی بہت شادی سے نفرت تھی
اس کی فکر افضل شاہ کو ہر وقت بھاری تھی

دوڑ :- سنو اگلا بیاں اب - عشق کا امتحان اب - بندہ قلم اٹھاتا - یا سین پر نظر مہر ہردم رکھیو داتا

یہی وہ سوانگ تھا جو موضع سکھانوں میں حمید اترولی والے کی پارٹی نے کھیلا تھا۔ پورا سوانگ جمالیاتی تخیئل حسین و جمیل استعارات رنگین و فصیح بامحاورہ روزمرّہ کی ادبی زبان اور فنّی خوبیوں سے ڈرامہ بھرا ہوا ہے ۔ کہانی کا پلاٹ کومک نہ بڑھانے کی وجہ سے کچھ مختصر کردیا گیا ہے ۔ اس کے مقابلے میں دو اور مشہور سوانگ ہاتھرس کے استاد مرادھر اور نتھارام پارٹی کے ہیں. نتھارام

کے سوانگ کے مصنف سرخ دہلوی شاگرد نتھارام ہاتھرس ہیں۔ تخلص اختشام میں موجود ہے پہلے استاد مرلی دھر کے سوانگ کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سوانگ ان دونوں سوانگوں سے قدیم ہے۔

منگلا چرن (حمد) دوہا :-

یا اللہ تعالیٰ میرے یا خالق زمیں کل جہان رتبہ تیرا ہو اعلیٰ تسکین
ہو اعلیٰ تسکیں کہا دلمیں اللہ تعالیٰ ہے ذرّے ذرّے میں رتبہ تیرا اعلی ہے
تجھ سا کوئی اور نہیں دوسا خوب دیکھا بھالا ہے سرس نگاہ ہو کر مولا سب جگ میں اجیالا ہے

دوڑ :- عرض ہے میرے خالق - تو اللہ جگ کا مالک - نظر کر رحم کی خدارا -
مرلی دھر نے سوانگ محبّت کی پتلی کا رچ ڈالا

دوہا :- سنا ہوئے گا آپ نے فارس شہر مدام تخت شاہ فیروز تھے اس جا پر سرنام

چوبولہ :- نیک چلن شاہ فارس تھا عاقل دانشور تھا بھاری
سبھی خوش ادنیٰ و اعلیٰ شاہ کی رعیت ساری
نظر پرجا پر ہردم رکھتے خوش تھے سب نر ناری
ادھک فوج قارون خزانے بھرے سبھی سرکاری

دوڑ :- سبھی شے بادشاہ گھر - اصل بن سب پھیکا زر - جگر میں انی دکھ
پایا - صرف کمی تھی لخت جگر کی لو سچ تمہیں بتایا۔[1]

یہ سوانگ ١٩١٠ ع سے پہلے کا لکھا ہے۔ کیونکہ ١٩١٠ ع کے قریب مرلی دھر کا انتقال ہوچکا تھا اسلئے اسکی زبان برج بھاشا ملی ہوئی اردو ہے اور نتھارام کمپنی کے سوانگ «محبّت کی پتلی» کی زبان اس کے مقابلے میں صاف ہے۔ واضح رہے کہ ہاتھرس چونکہ برج بھاشا کا خاص علاقہ ہے اسلئے وہاں کی عوامی اردو میں برج بھاشا کا مقامی صوتیاتی لگاؤ آنا ضروری تھا۔ پھر بھی کیونکہ نتھارام تھیٹریکل کمپنی ہندوستان گیر بن گئی تھی اور اس کی کتابیں بھی مقبول تھیں۔

١- ص ١ - ٢ سانگیت فالک محبت کی پتلی عرف فیروز مالی از استاد مرلی دھر
دیپ چند بکڈپو ہاتھرس

اس ڈرامے میں ان کے شاعر سرخ دہلوی شاگرد نتھارام گوزیا عرسی نے صاف خالص اردو ہی استعمال کی ہے۔ فیروز مالی کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے اس سوانگ میں پہلی بار اردو میں ہندوانہ طرز کی حمد باری تعالی یا منگلا چرن تخلیق کیا گیا ہے۔

دوہا :- اوّل سبکو سمرو آدی پرش بھگوان
جسکے فضل و کرم سے ہو مشکل آسان

چوبولہ :- نیک نامی شری شیام اور جھوٹا جہان زمانہ
ہر ایک کام کرنے سے پہلے اسے یاد فرمانا
اسکے سوا وقت ناقص میں کام نہ کوئی آنا
اپنا تو دارومدار کل ہے اسی پر ہی کل رہنا

بحر طویل :- ہے بھروسہ اسی کا ہر انسان کو حور جن و ملائک پریزاد کو
سبکا کرتا ہے پالن پوشرلون وہی ساتھ رہتا ہے ہروقت امداد کو
نہیں ہوتا مخالف کسے کے کبھی خوب سنتا ہے ہر ایک کی فریاد کو
اسکی رحمت کے باعث ہوئے نامور اعلیٰ رتبہ ملا اندر استاد کو

دوڑ :- رہے جو اس سے برہم - ہمیشہ ہوگا سر خم - نہ اسکو کبھی بھلانا -
نتھارام دج کہیں رات دن شیام رام گن گانا

آغاز داستان دوہا :- عجب خوشنما با ادب با عزت اہی رام
بڑھیا قابل دید ہے فارس ایک مقام

چوبولہ :- تاجدار فارس عالم فاضل پر نور بشر تھا
عاقل منصف رکھے رعایا پر ہردم ایک نظر تھا
اعلیٰ ادنیٰ ہر ایک مصاحب شاہ سے خوش اکثر تھا
لاثانی بیگم حسن مخزن عظیم لشکر تھا

دوڑ :- یہ سب کچھ گھر تھا۔ مگر نہیں کوئی پسر تھا۔ محض دل گھبرا کر

شہنشاہ فارس کا ایسے رہا رب سے منا کر

تینوں مشہور استاد جنکے سوانگ آجتک پورے ہندوستان میں پسند کئے جاتے ہیں. میں نے تقابلی نمونے کے طور پر پیش کردیئے ہیں. ان سے پتا چل جاتا ہے کہ بعض شاعر فنی خوبیوں سے بے بہرہ ہیں صرف فارسی الفاظ بھر کر ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ چوبولہ شاندار ہوگیا اس بات سے وہ واقف ہی نہیں کہ اس لفظ کی یہاں ضرورت ہے یا نہیں ہے. حقیقت یہ ہے کہ مرلی دھر دیہاتی برج بھاشا کے شاعر تھے. انیسویں صدی میں ایسے سانگیت ناٹک پسند کئے جاتے تھے. لیکن جب تعلیم کا رواج بڑھا اور اردو کا چلن ہر جگـــہ ہوگیا تو نئے سانگیت ناٹکوں کے مقابلے میں ان کا رنگ پھیکا پڑنے لگا. ہاتھرس جو اب نوٹنکی ڈراموں کا گڑھ بنا ہوا ہے یہاں کے سوانگ ۱۹۲۵ع سے پیشتر تک ماسٹر نتھاچند بکسیلر علی گڑھ شائع کراتے تھے انہوں نے سوانگ «پرتھوی راج راسا» مصنفہ مولوی کالیخاں عزیز شاگرد حضرت داغ دہلوی جو ۱۹۱۲ع میں طبع ہوا ہے سرورق کی پشت پر حسب ذیل نوٹس نکالا تھا.

ہماری یہ خواہش ہے کہ ہم پڑھے لکھے سانگیت بنانے والوں سے نئے نئے سوانگ بناکر چھپوائیں لہٰذا یہ نوٹس دیا جاتا ہے کہ جو صاحب سانگیت بنا سکتے ہیں میـــدان میں نکل آویں اور صحیح صحیح اور فصیح سانگیت بناکر ہم سے معقول تصنیف و تالیف حاصل کریں. مگر یاد رکھیں کے ان میں بے جوڑ غلط سانگیت ہم کبھی پسند نہیں کریں گے ایسے لوگوں کو مناسب ہے کہ خود کو شاعر نہ کہیں اور غلط سلط جھولنا بناکر ملک کو خراب نہ کریں. ص۲ سرورق

اس اشتہار سے ظاہر ہے کہ فصیح اردو کے سوانگ پسند کئے جانے لگے تھے. اور سوانگ برج بھاشا کو چھوڑ کر اردو بھاشا میں لکھے جانے لگے تھے، موضع سکھانوں کی نوٹنکی ڈرامہ دیکھنے کے بعد شاید ۱۹۴۶ع تھا. مجھے بدایوں کسی سرکاری کام سے جانا پڑا وہاں معلوم ہوا کہ پولس لائن میں کانپور کے ترموہن لال کی کمپنی آئی ہوئی ہے. اسوقت بھی سوانگ یا تماشا دیکھنے کا شوق لوگوں میں کم نہیں پایا جاتا تھا. لہٰذا کئی دوستوں کو ساتھ لیکر ہم بھی پولس لائین

پہونچے برسات کا زمانہ تھا پولس لائین کی بارگوں کے درمیان کافی بڑا میدان جس میں ڈرامہ کھیلنے کا انتظام کیا گیا تھا تماشے کا کوئی ٹکٹ وغیرہ نہیں تھا۔ گھومنے والی منڈلیوں کی طرح اسٹیج کیلئے میدان میں تخت ڈالدئیے گئے تھے۔ چونکہ بدایوں ہمیشہ سے اردو اور فارسی نہ صرف شاعروں کا مرکز رہا بلکہ یہاں بڑے بڑے صاحب علم اور سخن دان پیدا ہوئے ہیں بیشتر شوقین طبقہ شعر و سخن کی فنّی حیثیت سے واقف رہا ہے اسلئے کافی سمجھدار طبقہ سوانگ دیکھنے آیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں ایک اور بھی تماشہ دیکھنے کو ملا تھا۔ بات یہ تھی کہ ہملوگ بارگوں کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے میدان میں روشنی کا انتظام کم تھا اور زمین میں برسات ہونے کی وجہ سے کچھ ایسی پھسلن پیدا ہوگئی تھی۔ کہ کوئی کتنے ہی سنبھل کر گزرنے کی کوشش کرتا پھر بھی اسکا پاؤں ضرور پھسل جاتا۔ اور ناظرین کا ہر گرنے والے پر فضا میں ایک قہقہہ گونج اٹھتا۔ لیکن اسوقت کچھ شوق اتنا تیز تر تھا کہ نوٹنکی کا یہ ڈرامہ جو بدایوں شہر سے قریب ایک میل کے فاصلے پر پولس لائین میں تھا۔ اندھیری رات ہونے کے باوجود یہ میدان نوٹنکی دیکھنے والوں سے وقت سے پہلے بھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ نرموہن تھیٹریکل کمپنی اس وقت کی مشہور کمپنی تھی۔ اور گلاب بائی جو اسوقت کمپنی کی مانی ہوئی مشہور فنکارہ تھی۔ اور وہ اسوقت نوجوان نہیں تو جوان ضرور تھی۔ غرض دس بجے شب ڈرامہ شروع کیا گیا پہلے کھیل کا اعلان کیا گیا کہ ڈرامہ خدا دوست پیش کیا جائیگا خدا دوست ڈرامے نتھارام کمپنی کے مرلی دھر کمپنی اور متروмل و شری کرشن کھتری لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن نرموہن کے پاس اسکی کمپنی کا ملازم شاعر یاسین کا لکھا ہوا خدا دوست تھا اس نے اس وقت وہی کھیلا کھتری اور نرموہن دونوں کے خدا دوست کے ڈرامے یاسین کے ہی لکھے ہوئے ہیں اور دونوں کو ہی دوسرے ڈراموں پر فوقیت حاصل ہے۔ خدا دوست سوانگ کی بنیاد اس کہانی پر ہے جو فسانۂ عجائب میں بیان کی گئی ہے۔ اسکا مختصر پلاٹ اسطرح ہے کہ ملک یمن کا سلطان «خدا دوست» بیحد سخی تھا اسنے ایک فقیر کے مانگنے پر سلطنت راہ خدا میں اسے دیدی اور خود اپنے دو لڑکوں «شمس القا» اور «وجہ القمر» نیز اپنی ملکہ کیساتھ اپنے ملک کو چھوڑ کر فقیری کپڑوں میں دوسرے شہر میں جا

پہونچا شہر کی سرائے میں ٹھہرا۔ سرائے میں ایک دوسرا سوداگر جو کسی دوسرے ملک کا باشندہ تھا ملکہ کا حسن و جمال دیکھکر اسپر عاشق ہوگیا وہ خدا دوست سے اپنی حاملہ بیوی کے درد زہ کا بہانہ بناکر کے خدا واسطے پر اسکی مدد کرنے کیلئے ملکہ کو خدا دوست سے مانگ کر لے گیا۔ اور اس کو جہاز پر بٹھاکر جہاز کا لنگر کھولکر اپنے شہر کو چلدیا اور پھر اس نے ملکہ پر اسکے وصل کے لئے ناجائز دباؤ ڈالا۔ ملکہ نے سختی سے اسے دھتکار دیا اسکی زیادہ سختی کرنے پر اپنی عزت کے بچاؤ کیلئے ملکہ خنجر نکالکر اسکے سینے پر چڑھ بیٹھی سوداگر نے اپنی اس بے بسی کے تحت اپنی حرکت پر ملکہ سے معافی مانگی۔ اور ملکہ کو ماں بناکر اپنی جان چھڑائی ملکہ نے بھی ازروئے خدا ترسی اسے معاف کردیا ادھر دوسری طرف خدا دوست کافی انتظار کے بعد کہ ملکہ آجائے، ملکہ کی تلاش میں بچونکو ساتھ لیکر نکلا۔ تلاش اور ناامیدی کے ساتھ لئے ہوئے دریا کے قریب جاپہونچا اور اسے پار کرنے کیلئے ایک بچے کو کنارے پر چھوڑ کر اور دوسرے بچے کو کاندھے پر بٹھاکر دریا میں اترا جب وہ دریا کے وسط میں پہونچا تو کنارے کا بچہ چیخا۔ دیکھنے پر پتا چلا کے ایک شیر اس بچّے کو اٹھا کر جنگل کی طرف لئے جارہا ہے۔ اسی گھبراہٹ کے عالم میں جب وہ بچے کی مدد کو واپس ہوا تو کاندھے والا بچّہ دریا میں گرپڑتا ہے اور خدا دوست خالی ہاتھ رہجاتا ہے۔ اسی مایوسی کے عالم میں دریا کے پار پہونچتا ہے آخرکار غم و حسرت لئے یہ ایک طرف کو چل دیتا ہے اور تھکا ماندہ ایک شہر پناہ کے قریب پہونچ جاتا ہے رات ہونے کی وجہ سے شہر پناہ کا پھاٹک بند تھا اس شہر کے بادشاہ کا انتقال ہوچکا تھا اور تخت کا کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے وزیروں اور دوسرے سرداروں نے یہ طے کیا کہ جو شخص صبح کو سب سے پہلے شہر میں داخل ہو اسے بادشاہ بنالیا جائے۔ اس طرح خدا دوست شہر میں پہلا داخل ہونے والا فرد ہونے کی وجہ سے بادشاہ بنالیا گیا لیکن بادشاہت ملنے کے بعد بھی خدا دوست بیحد اداس رہتا تھا۔ آخر اس نے اپنا دل بہلانے کیلئے وزیر سے دو خوبصورت بچونکو لانے کیلئے کہا۔ اُدھر خدا دوست کے دونوں بچونمیں سے ایک بچے کو دھوبی نے دریا سے نکال لیا تھا۔ اور دوسرے بچے

کو ایک شکاری نے اس شیر کا شکار کرکے بچالیا تھا۔ اس زمانے میں بچوں اور آدمیوں کو غلاموں کی جگہ بیچنے کا رواج عام تھا۔ وزیر نے ان دونوں بچوں کو خرید لیا۔ اور بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ دونوں بچے اور بادشاہ حادثات زمانہ کے اثر سے اتنے بدل گئے تھے کہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ دوسری طرف وہی سوداگر ملکہ سے نالاں ہوکر اسے بادشاہ کے حضور تحفہ میں پیش کرنے کو لایا۔ ملکہ کو بغیر دیکھے بادشاہ نے ایک خیمے میں بھیج دیا اور ان دونوں بچوں کو ملکہ کے خیمہ کا پہریدار مقرر کر دیتا ہے ان دونوں بچوں نے رات بھر کی وقت گزاری کیلئے ایک نے دوسرے سے کوئی قصہ کہانی سنانے کی فرمائش کی اور ایک بچہ خود اپنی آپ بیتی سنانے لگا۔ ملکہ نے بھی اس کہانی کو سنا۔ اور اسطرح تمام بھید کھل گیا۔ اور پھر سب بچھڑے ہوئے آپس میں مل گئے۔ خدا دوست نے بھی قصہ سنکر اپنے بیوی بچوں کے مل جانے سے خوش ہوکر خدا کا شکر ادا کیا۔

سوانگ قریب دس بجے شروع ہوگیا۔ نقّارے کی آواز دور دور تک فضا میں بڑے دلکش انداز میں گونج پیدا کررہی تھی۔ لوگوں کی محویت بڑھتی جارہی تھی یاسین کا سلجھا ہوا کلام اور صاف زبان ایک ایک لفظ دلمیں تیر و نشتر کا کام کررہا تھا اور لوگ وجد سے جھوم جھوم اٹھے۔ چوبولے ، غزل ، قوّالی بحر طویل میں نرموہن اور گلاب بائی نیز عثمان جیسے فنکار اپنا اپنا فن بڑے دلچسپ انداز میں دکھارہے تھے۔ جسکا اس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ فنکاروں کو چاروں طرف سے داد بھی مل رہی تھی اور روپیوں کی بھی بارش ہورہی تھی۔ گلاب بائی کو میں نے پہلی مرتبہ گاتے ہوئے سنا تھا عجب گلا پایا تھا۔ اب جب کہ وہ بوڑھی ہوچکی میں کانپور اس سے ملنے کو گیا۔ لیکن وہ نہ مل سکی اسلئے کہ وہ اس وقت اپنے گاؤں (دیہات) جاچکی تھی۔ معلومات پر معلوم ہوا کہ وہ کافی عسرت سے زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن ۱۹۸۴ع میں جب دوبارہ کانپور جانا ہوا تو میرے ایک عزیز داماد قاضی شمیم احمد اور ان کے ایک دوست کی طفیل سے پہلے گلاب کی لڑکی سے اور بعد میں گلاب جان سے ملاقات ہوئی اب ۱۹۸۵ ع میں اترپردیش سرکار نے اس کو پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا ہے۔

سوانگ میں منگلا چرن (حمد) کے بعد رنگا کا پارٹ ادا کرنے والا فنکار کھڑا ہوا اور اپنی پاٹ دار آواز میں نغمہ ریز ہوا۔

دوہا :- شہر یمن مشہور ہے درمیان ایران
کسی وقت میں تھا وہاں خدا دوست سلطان

چوبولہ :- خدا دوست سلطان نیک دل سخی بہادر عادل
جسے مغربی سلطانوں میں شہرت عزت حاصل
شرع احمدی حکم خدا پر تھی پابندی کامل
کبھی کوئی اس سخی کے در سے گیا نہ خالی سائیل

قوالی :- خدا کہ نام پر وہ مال و زر اپنا لٹاتا تھا
کوئی سائیل کبھی خالی نہ اسکے در سے جاتا تھا
صبح سے شام تک خیرات خانے تھے کھلے رہتے
ہمیشہ سیکڑوں مسکین و گدا کھانے کو پاتا تھا
یمن تھا ان دنوں تخت چمن اس شاہ کے دم سے
کے جسکے روبرو باغ ارم بھی رشک کھاتا تھا
تھی ہر سو رحمت باغ یمن اور فیض جاری تھا
رعایا میں کہیں کوئی مفلس نہیں دکھاتا تھا
فقط شمس القا وجہ القمر فرزند تھے شہ کے
کہ جنکے حسن سے شمس و قمر بھی شرم کھاتا تھا

دوڑ :- شروع اب داستاں ہو سخاوت کا بیاں ہو مدد کر اے حق تعالیٰ خدا دوست سلطاں بنایا ترموہن نے اعلیٰ

یاسین کی اس غزل کو کافی سراہا گیا غزل اس موقع کی ہے جب خدا دوست اپنی بیوی اور بچوں سے جدا ہوکر بے یار و مددگار رہجاتا ہے۔

غزل :-

رنج صدہا دکھدیئے ہیں تو نے اسدم کیلئے میری ہستی کیا بنائی تھی خدا غم کیلئے
چھٹ گئی ملکہ پسر دونوں ہوئے لقمہ اجل میں رہا زندہ فقط دنیا میں ماتم کیلئے

غم الم رنج و محسن دردِ جگر درد فراق آتنے سامان کردیئے اس جان پر غم کیلئے
میں قضا کو ڈھونڈتا ہوں اور قضا ملتی نہیں حسرتیں صدہا جمع ہیں دلیں ماتم کیلئے

ڈرامے میں جس طرح نثری مکالمے کی اہمیت ہے۔ اسطرح ان ڈراموں میں بحر طویل کے ان منظوم مکالموں کو اہمیت حاصل ہے بلکہ منظوم مکالمے اور مسترنم اور جوشیلی آواز حقیقی اداکاری کے ساتھ دلکش دل دوز اور پر کشش بن جاتے ہیں۔ ۱۹۳۰ع تک دوہوں۔ چوبولوں۔ غزل۔ قوالی میں سوال و جواب زیادہ ادا کئے جاتے تھے لیکن بعد میں بحر متدارک کو دہرا کر کے ایک نئی بحر بنائی گو جو لمبی ہونے کی وجہ سے بحر طویل کہلانے لگی اور جب نقارے کی آواز کے ساتھ یہ مکالمے ترکی بہ ترکی اداکئے جاتے ہیں تو ناظرین محفل ایک تاثر کی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں نمونے کے طور پر ایک سین کے دو چار مکالمے پیش کررہا ہوں جب بد طینت سوداگر فریب سے ملکہ کو خدا دوست سے جدا کر کے اپنے جہاز میں لے آتا ہے اور جہاز لنگر اٹھاکر روانہ ہوجاتا ہے۔ تو سوداگر ملکہ پر جبر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اس فقیر کے ساتھ کیوں ماری ماری پھرتی ہو۔ ملکہ بتاتی ہے کہ وہ فقیر نہیں بلکہ شاہ یمن ہے۔ تو سوداگر کہتا ہے۔

بحر طویل۔ سوداگر :۔
پہلے پیاری تھیں گر آپ ملکہ یمن آج اس سر کی اے جان سرتاج ہو
شوق سے میرے اس دل کی ملکہ بنو ملکیت پر میری آپکا راج ہو

بحر طویل۔ ملکہ
ہم نے راہِ خدا چھوڑا تاج یمن دلکو مرغوب ہے گیروایہ کفن
ہفت اقلیم کی ملکیت ہیچ ہے بد مردود کر جلد اپنا دہن

بحر طویل۔ سوداگر :۔
اس جوانی میں کیوں ماری ماری پھرو حسن پر اپنے کر بحر خوباں رحم
عیش و عشرت کے ساماں مہیّا ہیں سب میری قسمت میں کر وصل اپنا رقم

جواب ملکہ :۔

لوحِ قدرت اگر دے تیرا وصل لکھ تو مٹادونگی اسکو بھی رب کی قسم
بد زبان بد سخن بند کر گفتگو وصل ہوگا نہیں سر بھی ہو گر قلم

سوداگر :۔
ایسی باتوں سے ہوگی رہائی نہیں ہر طرح میرے قابو میں سرکار ہو
داروُ وصل جب تک نہ دوگی پلا کبھی بیمار اچھّا نہ دلدار ہو

ملکہ :۔
جان جبتک دل ناتواں میں رہے آبرو کی حفاظت میرا فرض ہے
جان جائے بلا سے تو جائے چلی ہوگی ناداں وہ پوری تری غرض ہے

سوداگر :۔
جس قدر تجھ سے کرتا ہوں میں آرزو اتنی ہی ہوتی جاتی ہے زرد رو
سوچ اس وصل میں پھر مزا کیا رہا۔ گرچہ سختی سے لوٹی گئی آبرو

ملکہ :۔
میں نہیں چاہتی ہوں تیری آرزو جسقدر تجھکو ہونا ہے ہو ترش رو
آبرو کی قسم جان کے خوف سے مجھسے قربان وہ کی جائیگی آبرو

سوداگر (مکالمہ نثر) :۔ او آبرو کی دیوانی جانتی ہے آبرو کے معنی ؟

ملکہ (شعر) آغا حشر کے انداز میں

قدر اس گوہر کی ہے جس میں کہ اچھی آب ہے
آب ہی سے چرخ پر روشن شب مہتاب ہے
آبرو جب ہو نہ دنیا میں تو مرنا چاہئیے
آبرو پر جان کو قربان کرنا چاہئیے

حقیقت یہ ہے کہ ڈرامے کے مکالمے پڑھنے میں اتنے پر اثر اور دلکش نہیں لگتے جتنے کہ اسٹیج پر مکالموں میں اداکاروں کی اداکاری کے ساتھ جان پڑجاتی ہے۔ لوحِ قدرت کی تشبیہ پر لوگ تڑپ اٹھے تھے۔ واقعی یہ اچھوتی برمحل تشبیہ شاعری کے فن کی معراج تھی۔ ناظرین جھوم جھوم کر داد دے رہے

تھے۔ نہ کوئی زرق برق لباس نہ کوئی خاص سجاوٹ و بناوٹ لیکن سلجھی ہوئی اور پر اثر شاعری اور ادبی زبان لوگوں میں ایک برقی تاثری لہر دوڑا رہی تھی قریب ۴ بجے صبح تک ڈرامہ چلتا رہا۔ پبلک میں اٹھنے کا نام نہیں کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہورہا تھا جو جہاں تھا وہیں بت بنا ہوا تھا۔ ایک پرانی دھندلی سی یاد میں نے اوراق پر لکھنے کی کوشش کی ہے بچپن میں اکثر شری کرشن کھتری کا لکھا ہوا سوانگ خدا دوست دیکھا تھا میرے ماموں بھی اکثر اسے ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ بہت سے اشعار اسکے مجھکو اتنک یاد ہیں یہ سوانگ بھی یاسین صاحب کا ہی لکھا ہوا ہے۔ جو انہوں نے شری کرشن کیلئے لکھا تھا۔ اس میں بھی کافی نفسیاتی مکالمے ہیں۔ اور حس شعریت ہے زبان میں شیرینی ہے منگلا چرن کی جگہ کورس ہے یہ ڈرامہ یاسین نے نرموہن کے ڈرامے سے پیشتر لکھا تھا۔

رنگا - دوہا :-

گزرا ہے ایک بادشاہ شہر یمن درمیان فارس میں مشہور تھا خدا دوست سلطان

چوبولہ :-

خدا دوست سلطان خدا کا سچا نیک بشر تھا راہ خدا میں شب و روز وہ کرتا صدقے زر تھا
سخی نیک دل منصف عادل اور غریب پرور تھا کرنے کو وہ نام خدا پر فدا ہر گھڑی سر تھا

قوالی :-

خدا کے سچے پرستاروں کا فسانہ ہے ذرا سا امتحان دنیا کو ایمان کا دکھانا ہے
سوائے ذات خدا کچھ نہیں رہے باقی نہ وہ بشر رہے باقی نہ وہ زمانہ ہے
ایک ملکہ تھی پسر دونوں فقط شمس و قمر کہ جن کہ حسن سے رونق زنان خانا ہے

دوڑ - کروں آغاز فسانا - مدد خالق پہونچانا - تیرا یہ بندہ احقر ہے۔ شری کرشن کا افسانہ پیش نظر ہے۔

سین دربار (گانا) :۔

داور تیری قدرت کی ہر شے میں ضیا پاشی روشن ہے مہ تاباں ذرّوں میں تجلّائی

لیلیٰ کہیں کہلایا تصویر ادا بنکر پھر قیس کی صورت میں بن بن پھرا شیدائی
غنچے میں مہک بنکر خاموش رہا شب بھر گل بن کے مہک اٹھا جب باد صبا آئی
دھوکہ دیا بندونکو منصور کی صورت میں پھر دار پر چڑھوایا جب ہوگی رسوائی
سجدے میں سر جھکائے یاسین کیوں نہ اپنا ہے کھیل تیرا عالم زیبا تجھے یکتائی

ایک فقیر آتا ہے اور دربان سے کہتا ہے

خدا کے نیک بندے پر ذرا مطر مہر کردے کھڑا درویش ہے در پر شہنشاہ کو خبر کردے

داخلہ دربان مکالمہ :- عالیجاہ دربار میں ایک فقیر حاضر ہونا چاہتا ہے ۔

خدا دوست :- اسکو عزت سے لاؤ ۔

داخلہ فقیر - خدا دوست - غرض آنے کی کیا ہے کیا کوئی فریاد لائے ہو
تمنا ہے کسی شے کی کہ دشمن کے ستائے ہو

فقیر (قوالی) یہ قدرت اسکی جو ہے خشک کو چاہے وہ تر کردے
قمر کو شمس کردے شمس کو چاہے قمر کردے
خدا کے نام پر جس نے نہ روکا ہاتھ دینے سے
سخاوت میں اسی کا نام روشن در بدر کردے
گدا و شاہ کا رتبہ برابر اسکی نظروں میں
جسے چاہے اُدھر کردے جسے چاہے ادھر کردے
دیا جسے لیا اسنے نہ دیوے جو وہ کیا پاوے
ہے سردار اسپہ اپنا صدقہ جو وہ سر کردے
سخاوت میں تیرا حاتم سے بڑھکر نام روشن ہے
تہِ دل سے دعا دونگا تمنّا پوری گر کردے

کتنی صاف اور سلیس اور بامحاورہ زبان ہے ۔ کیا آپ کہہ بتاسکتے ہیں کہ یہ ڈرامے اردو کے نہیں طوالت کی وجہ سے مکالموں کا نمونہ نہیں دے رہا ہوں۔ بڑے اچھے فصیح اردو میں نفسیاتی پہلو لئے مکالمے دئیے گئے ہیں۔ یہ سلام بہت مشہور تھا مجھے بھی اسکے کتنے ہی اشعار یاد تھے۔ جنہیں بچپن میں اکثر

میں گنگناتا رہتا تھا۔ خدا دوست جب فقیر بن کر مع اپنی ملکہ اور دونوں بچوں کے اپنے شہر کے رہنے والوں سے رخصت ہوتا ہے۔ اسوقت یہ گانا پیش کرتا ہے۔

سلام

الوداع اے میرے وطن آخری اب تجھکو سلام + خوب ہی عیش کیا خوب ہی پایا آرام

اس سلام کے کل پانچ اشعار ہیں۔ جنہیں چاروں افراد ملکر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سنکر ایک رقت طاری ہوجاتی ہے۔

ہم کوچ کررہے ہیں خدارا سلام لو — باشندگان ملک ہمارا سلام لو
جب تک بھی آب و دانہ ہمارا یہاں رہا — راحت سے کرلیا ہے گزارا ہمارا سلام لو
تخت نشین سے جسنے ہے خاک نشیں کیا — ہر دم اسی کا رہتا سہارا سلام لو
اسکی نظر میں شاہ و گدا دونوں ایک ہیں — اسکا فقط یہی ہے اشارہ سلام لو
فصل بہار آئی مگر ہم تو چلدئیے — گلشن رہے آباد ہمارا سلام لو

رنگا۔ چلے وطن کو چھوڑکر یہ چاروں ناشاد + ادھر چرخ نے سوچ لی اور نئی افتاد

ہندوستان میں ہاتھرس کے نتھارام اور کانپور میں شری کرشن کھتری پہلوان بک ڈپو ہی سوانگ کی کتابوں کے مرکز ہیں ان دونوں بک ڈپوؤں کے سربراہ تجارتی دماغ رکھتے تھے۔ اور شری کرشن اور نتھارام دونوں کے یہاں شاعر نوکر تھے۔ اسکے علاوہ یہ دوسروں کے سوانگ خریدکر بھی اکثر اپنے نام سے چھپواتے تھے۔ آخر میں نرموہن کی کمپنی ختم ہوگئی۔ اور اسکی حالت سقیم ہوگئی۔ تو شری کرشن نے انکے سوانگوں کی کتابیں چھاپنے کے حقوق اس سے مول لئے۔ کچھ دن شری کرشن نے انہیں چھپوایا۔ پھر انہوں نے بھی چھاپنا بند کردیا۔ نرموہن اور شری کرشن کے خدا دوست سوانگ کے مقابلے میں روپ رام سلیم پوری نے نتھارام کے انتقال کے بعد سوانگ ۱۹۴۷ء میں لکھا۔ اسکی زبان دیکھئے۔

منگلا چرن (حمد) :-

عجب تمہارے کھیل ہیں عجب تمہاری شان — جگ تمپر قربان ہے میں انپر میں قربان

چوبولہ :-

مہربان سب انپر ہوں جنپر مہر تمہاری کل جہاں کے موجد ہو یا حق تعالیٰ باری
واہ واہ قدرت پر کرتی ہے دنیا ساری صفت بیاں کیا کرے آپکی یارب زباں ہماری

شعر :-

نہ جنکا کوئی دنیا میں تمہیں انکے سہارے ہو گلے مغرور کے چاہنے کو تم بینے دودھارے ہو
ہماری بھی خبر لینا کہ غمگینوں کے حامی ہو خدایا ہم تمہارے ہیں اجی بس تم ہمارے ہو

دوڑ :- یہی ہے غرض ہماری۔ ذرا ہو مہر تمہاری۔ یہ سر قدموں میں ڈالا۔
خدا دوست سکیت بنے وہ دلچسپ نرالا۔

جواب کوی کا رنگا :-

شہر یمن مشہور ہے فارس کے درمیان گزرا ایک ہے بادشاہ وہاں عظیم الشان

چوبولہ :- خدا دوست تھا نام سمجھ لو جو تھا خدا کا پیارا
فیاضی کے گلشن میں تھا یکتا پھول ہزارا
آج اسی کے ایماں کا دیکھو دلچسپ نظارا
رکھو شور و غل بند تو ہوئے بیحد احساں تمہارا

شعر :- ایک بیگم تھی محل میں دو لخت جگر
تھا بڑا شمس اللقاء اور خرد تھا وجہ القمر
خاندان سارا ہی شاہ کا تھا سخاوت پر نثار
بس عبادت میں ہی رب کی گزرتے تھے لیل و نہار

دوڑ :- یہی ہے التماس اب۔ غور سے سنئیے گا سب۔ حق سے بہت ڈرتا تھا۔
بادشاہ ہر روز ہی یوں رب سے عرض کیا کرتا تھا

غزل :- خدایا قہر کی نظر ہو نہ جاوے سخاوت سے خالی یہ گھر ہو نہ جاوے
گدا کوئی آئے تمنّا سے در پر تو یہاں اسکی خاطر عذر ہو نہ جائے
عبادت میں تیری رہوں بے خبر میں سخاوت میں اپنی صبر ہو نہ جائے

ہمیشہ قسدم یہ پڑے راہ حق میں　　جو ناراض کوئی بشر ہو نہ جائے
یہی عرض ایک بندے کی تجھسے ہے یارب　　سخاوت کا دل سے گزر ہو نہ جائے

ان نمونوں میں آپ کو ہر قسم کا شاعر ملے گا۔ اور ہر ایک کے کلام کا اندازہ بھی ہوجائیگا۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے نوٹنکی ڈراموں کے شاعروں میں دس پانچ ہی شاعر فنی شاعروں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ زبان سے زیادہ تر لوگ واقف تھے۔ اور یوں بھی تھیٹریکل ڈرامے چاہے وہ نثر کے ہوں یا نظم کے دونوں میں خامیاں نظر آتی ہیں پھر بھی ان میں کچھ لوگ اچھے اور فن کے جاننے والے بھی تھے۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ یہ ڈرامے عوام کیلئے لکھے جاتے ہیں۔ خواص کیلئے نہیں۔ اسلئے شعراء عروض کی زیادہ احتیاط کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ پھر سنسکرت ڈراموں کی طرح پر ڈرامے کا ماحول سمجھتے ہوئے ویسی ہی زبان اکثر و بیشتر استعمال کرتے ہیں۔ جیسے آلہ اور اودل کے رزمیہ سوانگوں میں دیہاتی برج بھاشا اردو کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ کانپور کے سوانگوں میں اودھی اور پوربی کی ملاوٹ بھی اردو کے ساتھ بہت سے ڈراموں میں دیکھی ہے۔ مذہبی ڈراموں کی زبان بھی برج بھاشا ملی اردو ہے اور کچھ ہندی جیسا کہ میں پچھلی سطور میں تحریر کرچکا ہوں کہ علیگڑھ کی نمائش میں نوٹنکی سوانگ کے بارے میں سنکر مجھے وقت نکالکر علیگڑھ جانا پڑا گھر والوں کی لاعلمی میں علیگڑھ پہونچا۔ اس سال کئی سال کے بعد نمائش ہورہی تھی۔ اسلئے نمائش گزشتہ سالوں سے زیادہ قرینے سے لگی تھی۔ انتظام معقول تھا۔ پولس کا انتظام بھی بہت اچھا تھا۔ رکشے ریلوے پھاٹک پر ہی روک دئیے جاتے تھے۔ آگے قریب ایک فرلانگ پیدل چلنا پرتا تھا۔ بھیڑ کافی تھی۔ سڑکوں کے دونوں جانب کو سائیکل اسٹینڈوں اور اسٹالوں نے گھیر رکھا تھا۔ جہاں ہزاروں سائیکلیں اور اسکوٹر کھڑے تھے۔ مزمل گیٹ بجلی کے رنگ برنگے بلبوں سے سجا ہوا دلہن بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسپر لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ جو نغموں کے ساتھ ساتھ اطلاعات کہوئے بچوںکے متعلقین سے ملنے کے بارے میں ان کے علاوہ ایڈورٹائزمینٹ بھی کرتے جاتے تھے۔ اور ملاقاتیوں کے ایک دوسرے کو پیغامات بھی دے رہے تھے۔ مسٹر میر تجمل حسین کریشی جہاں کہیں ہوں بارہ دری پر آجائیں مسٹر اقبال حسین انکے

منتظر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ آج کی ہندی تعلیم نے جسطرح بول چال تک کا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ اس پر افسوس کرنے کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر اور کچھ ذکر کروں تو مضمون طویل ہوجائیگا۔ چاروں جانب جدھر نگاہ اٹھتی تھی دوکانیں سلیقے سے لگی تھیں۔ نمائش دیکھنے والوں کا بیحد ہجوم تھا۔ دوکانوں پر بھی گاہکوں کی ہر طرف کثرت تھی۔ کیونکہ لمبے عرصے یعنی تین چار سال بعد نمائش لگی تھی۔ حلوے پراٹھے اور ہوٹلوں اور چائے خانوں کے تو پوبارے تھے۔ ایسی سخت سردی میں بھی لوگ سوفٹی آئس کریم کافی تعداد میں کھا رہے تھے۔ میں نمائش کے پھاٹک باہر کے بازار سے ہی میں تماشے والوں کے بازار کی جانب چلدیا یہاں چرخ، سرکس، جانوروں اور دوسرے قسم کے شعبدے بازوں کے ڈیرے تمبو تھے۔ آوازوں کے شور سے کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیرہی تھی۔ اسی اعتبار سے اسے ہاؤ ہاؤ کا بازار کہا جاتا ہے۔ میں یہاں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا جی ٹی روڈ تک آپہونچا جہاں دونوں جانب کھجرے والے اور مٹھائی والوں کی قطاریں تھیں۔ اسکے بعد بریانی، پراٹھے، کباب والوں کے ہوٹل تھے۔ کچھ دوکانیں چینی کے برتنوں کی بھی تھیں۔ وہیں خام راستے کے بائیں جانب ایک زبردست دیونما پھاٹک لوہے اور لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا نظر آیا وہیں پہ کوئی بیگھے زمین کا حصار کئے ہوئے تھا۔ ایک وسیع تنمبو سے ڈھکا ہوا قناتیں اور کئی ڈیرے تنمو لگے تھے گیٹ پر رادھا رانی کا تھیٹر نظر آیا خاکی اور سفید پینٹ کے بنے فائیبل سے سجا ہوا چوطرفہ ہرے پیلے لال رنگ کے چھوٹے زیرو واٹ بلبوں سے دروازہ جگمگا رہا تھا۔ اوپر ناگری رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ «رادھا رانی تھیٹریکل کمپنی آف بیسل پور» اور سب سے اوپر شیوجی کی مورتی تھی۔ آگے نیچے دونوں طرف ٹکٹ گھر کافی شاندار لگ رہے تھے۔ میں گیٹ کیپر سے اجازت لیکر کہ مالک تھیٹر کمپنی سے ملنا ہے اندر گیا۔ پنڈال کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ایک جانب اداکاروں کے ٹھہرنے کو راوٹیوں کی قطار تھی۔ دوسری جانب پنڈال کی قناتی دیواریں جو اسٹیج سے جاملی تھیں۔ اسٹیج اونچے چبوترے پر بنایا گیا تھا۔ آگے زمین کو نیچے سے کھود کر فرسٹ کلاس کی سیٹیں تھیں۔ جو ایک آہنی جنگلے سے فرسٹ سیکینڈ، تھرڈ میں منقسم

ہوگئی تھی۔ تھرڈ کلاس درجہ اسٹیج سے زیادہ دور تھا پھر بھی چلو پانچ ہزار افراد آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ پنڈال بھرا ہوا تھا۔ کیونکہ نمائش میں باہر سے آنے والوں کو رات گزارنے کیلئے نوٹنکی سے زیادہ دلچسپ اور آرامدہ جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ ٹکٹ لیا اور نوٹنکی میں گھس گئے ۴ بجے تک آرام سے تماشہ دیکھتے رہے۔ اسٹیج پردوں کا تھا۔ بڑے بڑے آٹھ دس فیٹ اونچے اور قریب ۵ فیٹ چوڑے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اسٹیج اندر کو بھی دس بارہ فٹ ہوگا۔ اس کی درمیانی جگہ میں کئی پردے رنگین اور مختلف سینریوں کو اپنے دامـــن میں لئے آویزاں تھے۔ کسی میں جنگل کی سبزی تھی تو کسی میں شـــہر کی، کسی میں پہاڑوں کا سین اسٹیج میں نیچے کی جانب بھی الیکٹریکل رنگین لائٹس تھیں۔ جو سین کی دلکشی میں چار چاند لگادیتی تھیں۔ سامنے ہی دو بڑے نقارے رکھے ہوئے تھے۔ اور انکے سامنے ہی کوئلے دہک رہے تھے۔ اور اسکے پاس پیروں سے بجنے والا ہارمنیم رکھا تھا نقارچی استاد ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ تھے۔ ہارمنیم ماسٹر ابھی آئے نہیں تھے۔ پاس ہی ایک ڈھولک کو ایک معمر شخص سوئٹر اور دھوتی میں ملبوس ڈھولک کو تیار کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے ایک اداکار کے ذریعے مالک کے پاس خبر بھیجی کہ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ وہ آپ سے آپکے تماشے کے بارےمیں کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے امید تو یہ تھی کہ چونکہ تماشہ شروع ہونیوالا تھا۔ شاید مالک ملنے کو ٹال دیں لیکن امید کے خلاف مجھے اندر بلالیا گیا۔ اسٹیج کے بائیں جانب دو تین راؤٹیاں لگی ہوئی تھیں ان میں بڑی راؤٹی میں دو سفری پلنگ بچھے ہوئے تھے انپر خوبصورت ریشمی گدوں کے اوپر رنگین پلنگ پوش بچھے ہوئے تھے جنپر خوبصورت لحاف بھی پڑے ہوئے تھے ایک پلنگ پر ایک ادھیڑ عمر کے لیکن تندرست بدن کے گورے رنگ کے ساتھ پیشاوری کٹ بال بادامی کرتا اور مدراسی تہمد باندھے لحاف کے کچھ حصے کو اوڑھے ہوئے ایک صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے سلام و دعا کے بعد اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں نوٹنکی پر ایک کتاب لکھرہا ہوں۔ آپ کچھ اپنے بارے میں نیز نوٹنکی کے اپنے زمانے کی دیکھی اور اپنے اور اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی، حقیقت بیان فرمانے کی زحمت کریں۔ ماسٹر صاحب

جنکے بارے میں معلوم ہوا کہ انکا نام محمد شریف تھا ماسٹر سرخی عرفیت تھی۔ اور وہ مشہور مرحوم اداکار بابو کے لڑکے ہیں انکے بڑے بھائی عزیز مشہور شاعر قمر جلالی جو پاکستان چلے گئے تھے کے شاگرد تھے۔ یہ کمپنی عزیز کی ہی قائم کی ہوئی ہے۔ اور انکے انتقال کے بعد ماسٹر سرخی اسکے مالک ہوئے، ماسٹر عزیز مرحوم اور ماسٹر سرخی مشہور و معروف نوٹنکی اداکار تتھارام کمپنی کے روح رواں رہے ہیں۔ اور یہ نوٹنکی دنیا کے مشہور اداکار ماسٹر نظیر کے چھوٹے بھائی ہیں جن کا تذکرہ میں پچھلے صفحات میں کرچکا ہوں۔ ماسٹر عزیز ایک نوٹنکی فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۱ع میں اور اسکے بعد کافی نوٹنکی ڈرامے لکھے جنمیں بھولا ساہوکار، تخم تاثیر، صحبت کا اثر، البیلی بیلا، ڈھول کا پھول، میرے حضور، بھائی بھائی، مشہور ڈرامے ہیں اور انکے مخطوطے انکے لڑکے آغا حسن کے پاس جلالی میں موجود ہیں۔

ماسٹر سرخی کے چہرے پر کچھ الجھن کے آثار نظر آئے۔ لیکن پاس ہی پلنگ پر دراز ایک چالیس پینتالیس سال کے قریب کی ایک عورت جو تندرستی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے تیس سال کی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس نے مجھے بڑی آؤ بھگت سے لیا۔ اور وہ بولی کہ حالانکہ شو کے شروع ہونے کا وقت قریب آچکا ہے۔ لیکن آپ کافی سفر کرکے آئے معلوم پڑتے ہیں۔ اور ہم آپکے لئے حاضر خدمت ہیں جو بات آپ پوچھنا چاہیں پوچھئے اور چاہیے تو شو بھی دیکھئے۔ آج کا کھیل «شیریں فرہاد» ہے۔ میں نے ماسٹر سرخی سے انکے اپنے بارے میں معلوم کیا تو وہ باتیں جو تذکرتاً کہتا آیا ہوں انہوں نے بتائیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ رادھا رانی کی ہمت سے کمپنی چلا رہے ہیں انکی پیدائش ۱۹۲۴ ع کی ہے۔ رادھا رانی نے بتایا کہ وہ اردو اور ہندی دونوں زبانیں جانتی ہیں۔ چودہ پندرہ سال کی عمر سے انہوں نے نوٹنکی کے کام میں حصہ لیا۔ اور ماسٹر سرخی سے شادی کرکے یہ کمپنی قائم کی۔ انکے نو بیٹے ہیں سات سگے اور دو سوتیلے۔ انہوں نے کہا میرے لئے سب برابر ہیں بلکہ سوتیلے لڑکے سگوں سے زیادہ ہیں۔ میرے سب لڑکے ماشا اللہ پڑھ رہے ہیں ایک لڑکا امسال P. M. T. کے امتحان میں لکھنؤ بیٹھا تھا۔ لیکن سفارش نہ ہونے کیوجہ سے کامیاب نہ ہوسکا۔ نوٹنکی تھیٹر کو

زندہ رکھنے میں ہمیں جی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے کہیں پولس کا دباؤ ہوتا ہے، تو کہیں اجازت نامے کا کیونکہ بڑے شہروں میں سنیماؤں کے مالک سیٹھ افسران وقت سے ملکر ہمیں اجازت نہیں ملنے دیتے۔ بہانہ یہ ہوتا ہے کہ نوٹنکی کیوجہ سے فساد ہوجائیگا۔ اور اصلیت یہ ہے کہ ہمارے پہونچنے پر انکے پکچر ہال خالی نظر آتے ہیں۔ ابھی ریٹھ کی نمائش میں اجازت نہ ملنے پر قریب ایک ماہ ہمیں بیکار پڑا رہنا پڑا۔ اتنا بڑا کنبہ اور ساز و سامان قریب چالیس ہزار روپیہ کے خرچے کا بار اٹھانا پڑا اور آمدنی ندارد۔ سرکار نے ٹیکس معاف کردیا ہے لیکن ویسے زبردستی کے کو ٹیکس ہمیں دینے پڑتے ہیں۔ اگر ہم پولس کے کہنے پر نہیں چلیں تو نسواں اداکاروں کے ساتھ ہمیں داداؤں سے نپٹنا دشوار ہوجاتے پھر اب ہندی کا زمانہ ہے۔ صاف اردو بولنے والے اداکار بہت کم ملتے ہیں۔ دوسرے پبلک فلمی گانے زیادہ پسند کرتی ہے اسلئے ہم نے اپنے پروگرام میں دو آئٹم رکھے ہیں۔ ایک ڈانس پروگرام جو حمد باری تعالیٰ یا منگلا چرن کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور دوسرا ڈرامہ حالانکہ یہ ڈرامہ ہمارا خاص نہیں ہے۔ پھر بھی آپ ڈرامہ ضرور دیکھئے۔ ہمارے خاص پروگراموں میں ڈرامہ «دھول کا پھول» «بھائی بھائی» «لیلیٰ مجنوں» «انارکلی» «پکار» وغیرہ ہیں۔ وہ ڈرامے آپ دیکھنے تو زیادہ لطف محسوس کرتے۔ بہرحال جیسا بھی ہے آپ کھیل دیکھیں یہ کہکر انہوں نے مجھے اپنے ہی خیمہ میں جگہ دیدی اور پیروں پر لحاف ڈالدیا۔ اناؤنس مینٹ ہورہا تھا۔ اور ریکارڈنگ بھی آخرکار قریب نو بجے شو شروع ہوا۔ پورا کمپاؤنڈ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ گاندھی جی کے بھجن ایشور اللہ تیرے نام کے ساتھ ڈانس پر پروگرام شروع ہوا۔ اسکے بعد زنانے اداکاروں نے کود پھاند کیساتھ ناچ دکھانا اور گانا شروع کیا پبلک موقع موقع سے تالیاں بجاکر اپنی خوشی اور اداکاروں کی پسندیدگی کا اظہار کرتی جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی انگلی والی سیٹیاں بھی بجنے کی آوازیں بھی شروع ہوجاتیں انھیں کے ساتھ خوش ہوکر انعام دینے کیلئے چاروں طرف سے روپیہ لئے ہوئے ہاتھ اٹھنے کا شمار بھی جاری تھا۔ اداکار ان لوگوں سے کچھ معلومات لیکر روپیہ وصول کرتا۔ اور اناؤنسر کو بتاتا اناؤنسر اسکا اعلان اسپیکر پر کرتا جناب جاہد کھان (زاہد خان) ہماری کلاکار کملیش بائی کو پانچ

روپیے کا پرسکار دیتے ہیں۔ ہم انہیں کمپنی کی طرف سے ہاردک دھنواد دیتے ہیں۔ اسکے بعد رادھا رانی نے ستیم شیوم سندرم کا کلاسیکل ڈانس پیش کیا جو بہت ہی اچھے ڈھنگ سے پیش کیا گیا تھا۔ جسے بہت سراہا گیا انکے لڑکے سنجے نے ڈسکو ڈانس بھی اچھا پیش کیا جو اپنی جگہ بہت غنیمت تھا۔ اور ماسٹر کھنہ نے جلتی چتا کیساتھ شہیدونکی خون آلودہ روح کے بھیس میں مشہور فلمی وطنی ترانہ «اب تمہارے حوالے وطـــن ساتھیو» اور اسکے ساتھ ہی ایک ڈانس اور بھی دکھایا یہ بھی کافی محنت اور ریاض میں ماہر ہونے کی علامت لئے ہوئے تھا۔ پبلک اس سے بہت زیادہ محظوظ ہوئی۔ اس کے بعد مختلف گانے ہوتے رہے۔ کملیش، راج پال، گیتا رانی وغیرہ ایک درجن اداکاروں اور موسیقاروں نے گانے اور ڈانس پیش کئے۔

چونکہ درمیان میں گانے پیش کرنے سے ڈرامے کے تسلسل میں اور ربط میں رکاوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ جس سے ڈرامے کی دلچسپی میں کمی واقع ہوسکتی تھی۔ میرے بچپن کے زمانے میں ان ڈراموں میں اس گیت مالا پروگرام کا رواج نہیں تھا ابتداء میں کوئی ایک آدھ غزل یا گانا کوئی فنکار سنا دیا کرتا تھا۔ انعام اداکاری اور ڈرامے کی منظوم ڈائی لاگ اور غزلوں پر ملتا تھا۔ میرے خیال میں اس گیت مالا پروگرام کے رواج دینے کا سہرا بھی آنجہانی چنّی لعل پچاسا کے سر ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۱۹۴۳ء میں استاد چنی لعل پچاسا مع اپنی پارٹی کے اسلام نگر کے قریب پانچ چھ کلومیٹر دور موضع دھرم پور میں کسی میلے کے موقع اپنی مختصر پارٹی لائے تھے۔ چونکہ میں اسوقت محکمۂ ٹیوب ویل میں نمبر ۳۵ اسلام نگر جو موضع چنی کرنی پور میں واقع ہے تعینات تھا۔ استاد کا نام سنکر کئی لوگوں کو ساتھ لیکر دھرم پور پہونچا یہ موضع میرے رہنے کے مقام سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں قریب دس بجے وہاں پہونچا ڈرامہ قریب شروع ہونے کو تھا۔ استاد چنی لعل ریشمی صافہ باندھے ہوئے ایک ململ کا کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے انکے پاس ہی دو لڑکے جن میں ایک کا سن بارہ یا چودہ سال کا ہوگا اور دوسرے کا نو یا دس سال کا سجے بنے بیٹھے تھے۔ شاید کڑھے ہوئے کرتے چوڑی دار پائجامہ کرولے اور سلمہ ستاروں

سے کڑھی ہوئی ٹوپیاں پہنے ہوئے کاندھے سے کمر تک دونوں کے پٹکے پڑے ہوئے تھے نیز پاؤں میں گھنگھرو بندھے تھے بعد میں پتا چلا کے یہ چنی لعل کے لڑکے شنکر شمبھو ہیں جو اب مشہور قوال ہیں۔ اس بار میں نے چنی لعل کو آخری بار دیکھا تھا۔ اسکے بعد وہ بمبئی چلے گئے تھے۔ ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے حمد یا منگلا چرن کے بعد استاد نے دونوں بچوں کو اشارہ کیا دونوں عجب انداز سے اسٹیج پر آکر کھڑے ہوگئے بھولے بھالے معصوم چہرے بیحد دلکش اور بھلے معلوم ہوتے تھے انہوں نے پہلے مجمع کو سلام کیا پھر آہستہ آہستہ ڈانس شروع کردیا ننھے ننھے قدم اور گھونگھروں کی آواز کلاسیکل رقص بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ بعد میں دونوں نے یکے بعد دیگرے تنہا تنہا بھی رقص دکھایا معصومانہ اور بچکانہ انداز میں کتھک رقص آہستہ آہستہ سماع بندھ گیا۔ اتنی کم عمر کے بچے یہ رقص کیا دکھاسکتے تھے۔ لیکن یہ سب استاد چنی لعل جنھوں نے لکھنؤ کے مشہور استاد بندہ دین سے کتھک رقص سیکھا تھا کے طفیل تھا۔ دونوں بچے اتنی کم عمری میں بھی اپنے فن میں ماہر معلوم ہوتے تھے۔ میرے خیال میں استاد ان دونوں کو رقاص ہی بناتے تو واقعی یہ انکے حقیقی وارث نکلتے لیکن استاد نے انھیں اپنی معاشی حالات کے پیش نظر قوال بنایا اور آج وہ انٹرنیشنل قوال ہیں بہر حال لوگ بڑی محویت کیساتھ ڈانس دیکھ رہے تھے اس سستے کے زمانے میں بھی بچوں کو انعام میں قریب سو سو روپئیے[1] کے کئی نوٹ ملے اچھے واقف کار لوگ جیسے بہی پور پواری کے زمیندار حسن صاحب ماشا اللہ خاں اور خانصاحب منصور خاں یہ لوگ جودھپور کے راجہ کے یہاں سے نوکریوں سے ریٹائر ہوکر اپنی اپنی زمینداریوں میں رہ رہے تھے۔ کئی لوگ قصبہ اسلام نگر و روداش کے روساء و شرفا اور علم داں بھی کھیل دیکھ رہے تھے۔ سب نے بچوں کا ڈانس اور شنکر کی گائی ہوئی غزلیں کافی پسند کیں۔ بعد میں استاد کو بھی رقص کیلئے مجبور کیا گیا استاد نے بھی لوگوں کے اصرار پر گھونگھرو باندھے اور کئی طرح کے کتھک ڈانس دکھائے۔ بتاشوں پر ڈانس کیا گیا اور ایک بتاشہ پر کوئی ضرب نہیں آئی۔ اور ایک ڈانس ایسا جس میں وہ بتاکر

۱۔ واضح رہے ۱۹۴۳ء میں سو روپیہ کا انعام بہت بڑا انعام تھا۔

جس گھنگھرو کو چاہتے وہ آواز دیتا تھا اور دوسرے گھنگھرو بے آواز رہتے تھے۔ یہ ایک عجیب قسم کا رقص تھا۔ یہ انکے لکھنؤ کے استادوں کی دین تھی۔ انہیں اس ڈانس پر خاں صاحب ماشا اللہ خاں جو کلاسیکل میوزک اور ڈانس کے کافی ماہر اور واقف کار تھے نے استاد کو ایک سو روپیے کا ایک نوٹ انعام دیا۔ انکی دیکھا دیکھی اور دوسرے لوگوں نے بھی استاد کو انعامات دئیے لیکن یہ انعامات استاد کے کمال کیسامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے۔ استاد نے دو ایک پکے گانے (کلاسیکل میوزک) رقص کیساتھ گائے و سنائے اسکے بعد ڈرامہ شروع ہوا ڈرامہ تھا چمبیلی ہٹیاری عرف مستانی گوجری جو اس زمانے میں کافی مشہور و مقبول تھا۔ استاد جی لعل کی پاٹ دار سریلی آواز حسینا و پیارے وغیرہ کی اداکاری ڈرامے میں لطف آگیا۔ طوالت کیوجہ سے دو چار اشعار ہی لکھ رہا ہوں۔ چمبیلی ہٹیاری کا قصہ کافی مشہور ہے یہ دہلی کے سکندر بادشاہ کے شہزادے کا قصہ ہے۔ انہیں ایک سرائے کی بھٹیاری نے اپنی محبت میں پھانس رکھا تھا دن بھر بادشاہ سرائے میں رہتا تھا اور اسکی شادی قصبہ ڈاسنی ضلع بلند شہر کے قریب موضع چونڈیرا جو اس زمانے میں ایک بڑا قصبہ اور ریاست تھی کے راجہ کی بیٹی سے ہوئی تھی راجکماری بیحد خوبصورت تھی لیکن بھٹیاری نے شہزادے کو غلط فہمی میں ڈالدیا کہ شہزادی بدصورت ہے اسلئے رات کو شہزادہ اپنی آنکھوں کے دکھنے کا بہانہ کرکے آنکھوں پر پٹی باندھ کے محل میں آتا تھا۔ جس سے شہزادی کو بہت افسوس ہوتا جب اسے چھبیلی بھٹیاری کے بارے میں معلوم ہوا تو اسنے اپنی ساس سے اجازت لیکر ایک دہی والی گوجری کا بھیس بدلا اور وہ شہزادے سے سرائے میں ملی۔ اور اسطرح شہزادے کو بھٹیاری کے پھندے سے چھڑایا۔ ڈرامہ کے ابتدائی اشعار سنئیے یہ ڈرامہ بھی باسین کا لکھا ہوا ہے۔ ان اشعار میں بے اولادی کی رسم کے متعلق ہندوستانی رسم و رواج اور سماج کی ذہنیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

منگلا چرن (حمد) :-

دوہا :- کسن سے دو پیدا کئے عجب بہارستان
لگے پھول ہر قسم کے جن و ملک انسان

چوبولہ :۔ جن و ملک انسان کے پابند ہوئے الفت کے
نیک و بد اعمال ثمر دونوں جہاں جنت کے
برستے پروقت آبِ کوثر اور بادل رحمت کے
خزاں بہار کے موسم لاتے ہیں نازاں قسمت کے

دوڑ :۔ نرالا تو گل چیں ہے۔ نہ ثانی تیرا کہیں ہے۔ پاک پروردگار ہے ذرے سے آسماں تلک تیری ہی یادگار ہے۔

جواب رنگا۔دوہا ۔
شور و غل کو بند کرو حاضرین شوقین نیا نرالا اک سنو مضمون یہ رنگین

چوبولہ :۔ مضمون یہ رنگیں شہر دہلی ہے بہت پرانا
کسی زمانے میں تھا وہاں سکندر بادشاہ یک دانا
رعب زلزلہ حکم و دب دبہ غالب تاج شاہانہ
فوج رسالہ پلٹن توپیں تھا کم نہیں خزانہ

کڑا :۔ سکندر شاہ پر ایسی خدا کی مہربانی تھی
نہ جگ میں راجدھانیٔ سلطنت دھلی کی ثانی تھی
مہر الطاف سے رب کی مہیا تھا ہر اک ساماں
مگر اولاد بن اسکے نہایت جانفشانی تھی
ہے اک دن کا ذکر حضرت صبح کو بام پر آئے
اچانک اس طرف سے ایک جاتی مہترانی تھی

دوڑ :۔ دیکھ حضرت کی صورت ہوئی دلمیں نفرت۔ ہوا غم سے دل مضطر۔ آسماں کی طرف دیکھ کے کہے خاک روب کی دختر

جواب مہترانی :۔ آج صبح آیا نظر جسکے نہیں اولاد کھانے کو ملنا کٹھن خدا تو کر امداد

چوبولہ :۔ خدا تو کر امداد رزق جس سے مجھکو ملجاوے
ورنہ دیکھ شاہ کی صورت آن نظر نہیں آوے

صورت میں ناثور صبح جو دیکھے سولی پاوے
بادشاہ ہوا تو کیا ہوا جو بے اولادا کہلاوے

دوڑ - کسی سے نہیں جدا تو. مشکل کشا تو. عقل کی نہ ہوتی کوئی کبھی نہ
آتی فجر ادھر جو خبر مجھے یہ ہوتی۔

یہ تھے چھبیلی ہشیاری عرف متوالی گوحری کے چند ابتدائی اشعار. یاسین نے کافی محنت سے یہ ڈرامہ لکھا ہے رات بھر بڑا لطف حاصل ہوا یہ بات ڈانس سنگ پروگرام یا دیپ مالا کو دیکھکر ذہن کے ماضی کے جھروکوں سے نکل آئی تھی اب اصل تذکرہ نمائش کے رادھا رانی تھیٹر کا سنیے دیپ مالا پروگرام کے بعد ڈرامہ شروع کیا گیا میں ڈرامے میں قدیم اداکاری کا رنگ دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ کوسوں تک نہیں تھا. ماسٹر سرخی، رادھا رانی، کملیش کماری، ماسٹر رمیش کے علاوہ سبکی اداکاری ناتجربے کارانہ تھی. معلوم ہوتا تھا کہ باقی سلوگ فلمی گانوں اور ڈانس کے لئے ہی موزوں ہیں نوٹنکی اداکاری کے لئے نہیں. انکی آوازیں بھی نوٹنکی سوانگوں کے قابل نہ تھیں اسکے لئے زندہ جاندار اور بلند آواز چاہئیے وہ ان میں نہ تھی یہ اداکارائیں اور اداکار کچھ زندگی سے تھکے تھکے سے بھی معلوم ہوتے تھے جیسے زندگی کی دوڑ نے انہیں پست کردیا ہو لیکن رادھا رانی اور ماسٹر سرخی اور ماسٹر رمیش کے بحر طویل کے مکالمے ڈرامے میں پھر بھی کچھ غنیمت تھے. اب شیریں فرہاد ڈرامے سے کچھ اشعار پیش کررہا ہوں یہ ڈرامہ اندرمن اسکول کے نتھارام پارٹی کا ہے شاعر کا نام اللہ نور مضطر ہے جس کا آپ مشہور سانگیت مالک جدید نوٹنکی شہزادی عرف نقل مالن پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرماچکے ہیں دونوں کی زبان موازنے کے لائق ہے. نتھارام کی پارٹی کا یہ ڈرامہ ۱۹۲۴ء کا لکھا ہوا ہے. فصیح اردو ہے اور سب خاص و عام کے دلمیں اترتی بھی چلی جاتی ہے۔

دوہا :-

کیا ہے طاقت زبان کی اے رحیم رحمانؒ تیری قدرت کی کرے جو تعریف بیان

چوبولہ :-

یارب تو خاک سے چمن کے پھول کھلانے والا آسمان پر انجم شمس و قمر بنانے والا
نگہبان تو ہی ہے کام میں ہردم آنے والا گنہگار بندوں کی کشتی پار لگانے والا

غزل -

ہرجا ہے نور تیرا ہرجا تیری خدائی کیا کیا طرح کی تو نے ہر چیز ہے بنائی
کاریگری نرالی تیری ہے یا الٰہی نکہت گلوں کو بخشی پھر دیدی خوشنمائی

دوڑ - خدا کا شکر اداکر۔ اندر استاد مناکر بتاتا ہوں قصہ لاثانی۔ شیریں اور فرہاد کی الفت بھری کہانی۔

آغازِ داستان :-

غل و شور کو بند کرو سنئیے دیکر دھیان ملک فارس کے تخت کا تھا خسرو سلطان

چوبولہ دوہا :-

تھا حسین و مہ جبیں شاہ خسرو کی نئی عمر تھی
صبح و شام رہتی جسکی رعیت پر نیک نظر تھی
شیریں ادھر ملک ارمن کی سنو تاج افسر تھی
نوجوان شـــــریں زبان گل بدن پری پیکر تھی

شیریں فرہاد ان قدیم ڈراموں میں سے ہے جسے سب سے پہلے پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے اپنے لئے لکھوایا اور اسٹیج کیا بعد میں دوسرے کئی مصنفین نے بھی اسے لکھا نوٹنکی ڈراموں میں بھی شیریں فرہاد منظوم اور ڈرامائی شکل میں بہت قدیم زمانے سے پیش کیا جاتا رہا ہے اور مختلف اصحاب اس پر طبع آزمائی اپنے اپنے طور پر کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن تین کمپنیوں کے ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے اور یہی زیادہ مشہور بھی ہوئے ان میں نتھارام کے گروپ کے ڈرامے کے اشعار اوپر پیش کرچکا ہوں۔ نرموہن کی کمپنی کا ڈرامہ یاسین نے لکھا ہے جو اب نایاب ہے۔ شری کرشن کا ڈرامہ جسکے چند اشعار پیش خدمت کرتا ہوں۔ ڈرامہ یہ بھی لکھا ہوا یاسین صاحب کا ہی ہے۔

حمدِ خدا دوہا :-

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تیرا نور و ظہور ہرجا تو موجود ہے کیا نزدیک اور دور
ذرے کو خورشید اور قطرے کو دریا دیکھا گلوں میں یارب مہک چہک بلبلوں میں نغمہ دیکھا

دوڑ :- تیرا اگر فضل و کرم ہو۔ دور سب رنج و الم ہو۔ مہر کی نظر سدا رکھ۔
شجر علم میں نخل ہنر سے دامن ہرا بھرا رکھ۔

رنگا :-

ملک ایک فارس عجیب عجب تھی جسکی شان کرے سلطنت تھا جہاں خسرو شاہ جہان

چوبولہ :- خسرو شاہجہاں حسن میں یوسف کا ہمسر تھا
دیکھکے جسکی صورت کوخود صدقے شمس وقمر تھا
غنیم کا دل دہلانے والا بے شمار لشکر تھا
خوش مزاج خوش حال نیک حصلت غریب پرور تھا

دونوں ڈراموں کی زبان ابتدا سے اختتام تک یکساں ہے۔ یہ تھا میرا فی الحال نوٹنکی ڈرامہ دیکھنے کا ماضی اور حال اور اپنے دیکھے ہوئے ڈراموں کا مشاہدہ اسوقت ہندوستان اور پاکستان بننے کے بعد نوٹنکی ڈراموں کی کیا حالت ہے۔ اسپر چند سطور لکھنے کی بھی ضرورت محسوس کررہا ہوں۔ تھیٹریکل ڈرامے تو سنیما کی ترقی کے بعد ملک میں سے غائب سے ہی ہوگئے اب دو ایک رام لیلا کھیلنے والی پارٹیاں کبھی کبھی دو ایک مذہبی ڈرامے کھیل لیتی ہیں پیشہ ور نوٹنکیاں اور انکی کمپنیاں قریب قریب ناپید ہیں۔ سوانگ کھیلنے والی کمپنیاں ہوں ابھی زندہ ہیں اور مقبول ہیں۔ جس شہر دیہات میں پہونچتی ہیں عوامی طبقہ کے لوگ اسکا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ آج بھی مسٹر تصوّر علیخاں ساکن ردولی ضلع بارہ بنکی برابر نوٹنکی ڈرامہ لکھ رہے ہیں اور ان کے ڈرامے بھی بے حد مقبول ہیں اسکے علاوہ محمد شریف کرن جونپوری کے منظوم نوٹنکی ڈرامے بھی انکی گنگا جمنی اردو ہونے کی وجہ سے کافی پسند کئے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے ٹھیٹ ہندی میں بھی ڈرامے لکھے ہیں لیکن وہ عوام میں مقبول نہیں ہوسکے تصور علیخاں کے منظوم ڈرامے کی مقبولیت کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ ایک ڈرامے کے سات سات آٹھ آٹھ ایڈیشن ۱۹۶۰ع سے ۱۹۸۲ع تک چھپ چکے ہیں۔ اور ہر کتاب کا ایک ایڈیشن چار چار پانچ پانچ ہزار سے کم شائع نہیں ہوتا۔ جس ڈرامے کے میں یہاں کچھ اشعار دیرہا ہوں وہ تین ہزار کی تعداد میں ساتویں بار چھاپا گیا ہے۔ ڈرامہ «خونی لڑکی» سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ کہانی کا پلاٹ پرانی ہندوستانی کہانیوں جیسا ہے دھارا نگر کے راجہ کے امار نام کی لڑکی پھول متی نام کی بھتیجی ہے اسکے

دو فوجی سردار بھی ہیں ۔ ایک کا نام رنجیت سنگھ جو ایک باوفا اور نیک طنیت سردار ہے ۔ دوسرے سردار کا نام پرتاب سنگھ ہے جو ایک سفلہ اور بدطنیت شخص ہے ۔ پھول متی بھی طنیت کی اچھی نہیں ہے ۔ راجکماری انار کو ایک جادوگر اڑا کر لیجاتا ہے ۔ رنجیت سنگھ ایک سادھو کی دی ہوئی بانسری کی مدد سے چینی جادوگر سے انار کو بچالیتا ہے ۔ پھول متی اور پرتاب سنگھ کی اڑچنے پیدا کرنے کے باوجود رنجیت سنگھ کامیاب ہوتا ہے ۔ انار کی شادی رنجیت سنگھ سے ہوجاتی ہے ۔ پھول متی اور پرتاب سنگھ بھی معاف کردئیے جاتے ہیں ۔

میری ڈرامے کے پلاٹ پر نہیں زبان پر زیادہ نظر ہے جو اردو ہے ۔ اور تصور علی کے کل ڈراموں کی زبان خالص گنگا جمنی اردو ہوتی ہے ۔ بلکہ دوسرے شعرا کی طرح برج بھاشا ملی ہوئی اردو نہیں ہوتی ۔ یہی حال محمد شریف کا ہے انکے ڈراموں کی زبان بھی بول چال کی اردو ہے ۔ یہ ہیں تصور علیخاں کے ڈرامے حونی لڑکی کے چند اشعار ۔

رنگا دوہا :۔

دھارانگری ہند میں ہے خوشنما مقام وہیں کی ہے داستاں سنئیے خاص و عام

چوبولہ :۔

سنئیے خاص و عام وہیں کا ہے دلچسپ فسانہ امرناتھ راجہ ہوا ایک ویردھیر مردانہ
انارو اک پتری تھی انکی مثل پری گل دانا افسر ایک پرتاب سنگھ تھا اسپر دیوانا

بحر طویل :۔

ایک بھتیجی امرناتھ کے گھر میں تھی پھول متی نام اسکا مہربان تھا
تھی دغا کی وہ پتلی دغا میں بھری اسکی چالوں سے لاچار شیطان تھا
دل میں حسرت تھی پیدا پسر ہو کوئی پر نہ امید بر آئی سنسار میں
بس یہی فکر رہتی تھی آٹھوں پہر بیٹھا رہتا تھا رنجیدہ دربار میں

محمد شریف کرن جونپوری نے کافی عرصے تک شری کرشن پہلوان کے یہاں کانپور میں نوکری کی اور ڈرامے لکھے ۔ شری کرشن کے مرنے کے بعد وہ کھتری بک ڈپو سے الگ ہوکر اپنے ڈرامے لکھ رہے ہیں ۔ انکے جس ڈرامے سے میں اشعار پیش کررہا ہوں اسکا نام ہے « امر تیاگ » یہ ایک اصلاحی ڈرامہ ہے ۔

ہندوستان سے اچھوت پن اور ذات پات کی بندشوں کو توڑنے کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔ جسکا پلاٹ یہ ہے کہ رگھوا نام کا ایک ہریجن اپنی لڑکی چمیلی کو اسکی بد چلنی پر اسکا گلہ گھونٹ کر مارڈالتا ہے۔ زمیندار کو خبر ہوتی ہے وہ اسپر دباؤ ڈالکر اسے زد و کوب کرکے اسے لڑکی کے قتل سے بچانے کے بدلے میں اس سے اسکی زمین لکھوا لیتا ہے اور چھوڑا دیتا ہے وقت گزر جاتا ہے رگھوا کی چھوٹی لڑکی لکھیا بھی جوان ہوجاتی ہے اور ادھر زمیندار کا لڑکا دیپک انجنیرنگ پاس کرکے گاؤں آتا ہے وہ نئے خیالات کا پروردہ ہے اور چھوت چھات ذات پات کو نہیں مانتا اور لکھیا پر عاشق ہوجاتا ہے۔ دونوں سچی محبت کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ زمیندار اور رگھوا دونوں ہی مخالفت کرتے ہیں اور اس محبت کے جال کو توڑنا چاہتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں لکھیا کو زہر دیا جاتا ہے مگر وہ بچ جاتی ہے آخر میں دونوں شادی کرلیتے ہیں اور گاؤں چھوڑ دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :۔

رنگا دوہا۔ یوپی کے ایک گاؤں کا قصہ ہے پرجوش ذرا دھیان دیکر سنو مہربان خاموش

چوبولہ :۔

مہرباں خاموش قوم کا ہریجن ایک رگھوا تھا اس غریب پر زمیندار کا کیا کیا ظلم ہوا تھا
رہا آن پر مرنے والا قوم کا بھی اگوا تھا مگر پیٹ بھر کبھی نہ کھانے کو پاتا ستوا تھا

کڑا :۔

چمیلی نام کی ایک خوبصورت اسکی تھی بالا آہ بھرتا تھا اسکو دیکھکر ہر ایک دل والا
کروں تعریف کیا اسکی بلا کی حسینہ تھی کوئی کہتا تھا نرگس ہے کوئی کہتا مدھو بالا

یہ تھا اردو کے عوامی غنائیہ ڈراموں کا مختصر سا ماضی و حال یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اردو کے رسم الخط کے زوال اور اردو کو ایک نسل سے دور کردینے کی وجہ سے اب اس صنف کو ایسے فاضل شاعر نہیں مل سکیں گے جو اس عوامی زبان میں نوٹنکی ڈرامے لکھ سکیں گے۔ کیونکہ ہندی کی یہ صنف ہے نہیں اور اردو کے ادبی لوگ ہمیشہ اسے حقارت سے دیکھتے چلے آئے ہیں اور اسی لئے یہ صنف ڈرامہ ہمیشہ سے ادنیٰ درجے کے شعراء کے

ہاتھوں میں رہی ہے اور رہے گی۔ لیکن پھر بھی ان ڈراموں کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ ان قدیم منظوم ڈراموں کے پچیس پچیس تیس تیس بلکہ بعض ڈراموں کے تو پچاس پچاس باون باون ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور آئندہ بھی برابر چھپتے رہیں گے کیونکہ یہ بول چال کی اردو زبان میں ہیں ہندی والوں کی کوششیں جیسے فلمی دنیا میں زبان بدلنے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ اسطرح صنف ڈرامہ میں بھی کامیاب نہیں ہوسکیں گی۔[۱]

۱۔ زیر ترتیب کتاب «ہندوستانی لوک ناٹک روایات اور اسالیب» مکمل ہونے کے قریب ہے مذکورہ بالا کتاب کے تین حصے ہیں پہلی جلد میں ۱۴۵ صفحات اور ۱۱ ابواب ہیں ہندوستانی منظوم لوک ناٹک کی ابتدا و ارتقا سے چھایا ناٹک یا کٹ پتلی، کوتوپانچ، راس لیلا، رام لیلا، یکش گان جاترا۔ بھوائی تماشہ پر مفصل مضامین ہیں۔

دوسری جلد ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اس میں متھرا اور آگرہ کے بھگت کے سانگ خیال بالاولی کی ابتدا راجستھان کے خیال کے ڈرامے چار بیت کا ذکر ہے۔

تیسری ضخیم جلد جو صرف قدیم اور جدید نوٹنکی کی تفصیلی ارتقائی تاریخ ہے میں ۶۵۰ صفحات اور ۷۰ ابواب ہیں سوانگ کی ایکتا سے لیکر مختلف علاقوں کے سوانگوں یا لوک ناٹکوں کا ذکر ہے امروہہ اور لکھنؤ جدید یا نوٹنکی کا موجد ہے۔ بھگت سے لیکر اندر سبھا اور نوٹنکی تک کا ارتقائی تفصیلی ذکر نوابین شجاع الدولہ و آصف الدولہ و نصیر الدین وغیرہ کے بھگت و جلسے نواب واحد علی شاہ کے رہیس، امانت اور مداری لال کی اندر سبھائیں اور ان پر تفصیلی بحث، بدایوں کے پہلے معیاری اور پختہ گو شاعر نرائن داس شعلہ جدید سانگوں کے خالق کی حیثیت سے اندرمن اسکول کے خالق استاد اندرمن جہانگیرآبادی اور ان کے شاگرد نتھارام اور کانپور یا لکھنؤ اسکول کے خالق ترموہن لال و شری کرشن پہلوان اور مختلف منظوم ڈرامہ نگاروں کا ذکر ہے ساتھ میں انکے نمونے کے اشعار بھی دئیے گئے ہیں۔

• • •

ڈاکٹر گیان چند
شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی،
حیدر آباد (آندھرا)

اردو کی ہکاری آوازیں اور حروف

(اس مضمون کا ارتقا کئی منزلوں میں ہوا ہے۔ رسالہ آہنگ گیا بابت ستمبر ۱۹۸۴ع میں ڈاکٹر ابومحمد سحر کا مضمون "دوچشمی ہے" شائع ہوا اِس میں اس موضوع سے متعلق اہل صوتیات کے بیانات پر طنز تھا۔ میں نے اس کا ایک مختصر جواب لکھ کر رسالہ آہنگ کو بھیج دیا۔ آہنگ بند ہوگیا تو میں نے اس کی نقل رسالہ شاعر بمبئی کو اشاعت کےلیے بھیج دی۔ ڈاکٹر ابومحمد میرے پرانے دوست اور کرم فرما ہیں وہ املا اور رسم الخط کے موضوع پر غور وخوض کرکے لکھ رہے ہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے جوابی مضمون کا لہجہ درشت تھا میں نے رسالہ شاعر کو لکھ دیا کہ مضمون شائع نہ کریں۔ آہنگ کو نہ لکھا کیونکہ وہ بند ہوگیا تھا ایک عرصے کے بعد یکایک پرچہ دوبارہ جاری ہوگیا اور اس کے اکتوبر ۸۶ ع کے پرچے میں میرا مضمون "ہائے مخلوط" چھپ گیا مجھے افسوس ہوا میں نے ڈاکٹر سحر کو معذرت کا خط لکھا اور آہنگ کو معذرتی مراسلہ کہ اسے شائع کردیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے آہنگ پھر دم توڑ گیا ہے

اس اثنا میں ڈاکٹر ابومحمد سحر کے بعض مضامین اور دوسروں کی تحریریں پڑھ کر میں نے اس موضوع پر ایک مفصّل مضمون "اردو کے ہائیہ حروف" نخلستان، جے پور بابت اکتوبر ۱۹۸۵ع تا مارچ ۱۹۸۶ع میں شائع کیا دسمبر ۱۹۸۶ع میں شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی نے املا و رسم الخط پر ایک سیمنار کیا اس کےلیے میں نے نخلستان والے مضمون کی ابتدا و انتہا میں بہت کچھ اضافہ و ترمیم کے ساتھ ایک مضمون "اردو کے ہکاری حروف" لکھا اور وہاں پڑھا یہ اس مضمون کی

تیسری جون ہوئی. سیمینار میں اس موضوع پر دوسروں کے تبصرے سنے. اُس کے بعد بھی بہتوں کا نقطۂ نظر واضح نہ ہوا. بعد میں مراسلت کے ذریعے ان کے خیالات معلوم کیے ان سب کی روشنی میں سیمنار والے مضمون کو نئی ترتیب اور ترمیم کے ساتھ آخری شکل دی. آئندہ اس موضوع پر مزید کچھ نہیں لکھا ہے. قارئین سے درخواست ہے کہ مضمون کے سابق نقوش کو نظر انداز کرکے صرف موجودہ تحریر کو معتبر مانا جائے.)

ھ (ہائے ہوّز) کی آواز حلقوم سے نکلنے والی صفیری آواز ہے جسے ادا کرنے میں اعضائے نطق کو دوسرے تمام مصمتوں کی نسبت کم محنت کرنی پڑتی ہے اسی کی شکل ہکاریت (ASPIRATION) ہے جس میں بعض مصمتوں کو ادا کرتے وقت معمول سے زیادہ ہوا کا اخراج کیا جاتا ہے پہلی ہے کو ہائے ملفوظی اور دوسری کو ہائے مخلوط کہتے ہیں بمبئی میں رشید حسن خاں نے مجھے یہ معرکے کی بات بتائی کہ کتابت کا یہ فرق فورٹ ولیم کالج میں طے کردیا گیا تھا. ۱۸۰۱ع کی میر امّن کی تحریر میں اس کا خیال رکھا گیا ہے. انیسویں صدی کے وسط میں جاکر عام طور سے یہ رواج ہوگیا کہ ہائے مخلوط کو محض دوچشمی ھ سے لکھا جانے لگا اور دوچشمی ھ کا استعمال ہائے ملفوظی کے لیے ممنوع ٹھہرا. رشید حسن خاں نے اپنی عالمانہ کتاب «اردو املا» (دلّی ۱۹۷۴ع) میں ذوق کے اس دلچسپ شعر کی طرف توجہ دلائی ہے

ہائے رے حسرتِ دیدار، مری ہائے کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے[1]

ذوق کے اس مشاہدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں بھی ہائے ملفوظی کو دوچشمی ھ سے لکھنا غیرمعمولی صورتِ حال تھی. اب کوئی کاتب ایسا نہیں کرتا

دوچشمی ھ والی آوازوں کو لسانیات میں ہکاری آوازیں کہتے ہیں «ہکاریت»

(۱) ڈاکٹر تنویر علوی (مرتب)، کلیاتِ ذوق (ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ع) ص ۲۰۱

خوشگوار ترجمہ نہیں عربی «ہ» پر ہندی «کار» اور پھر فارسی «یت» کا لاحقہ لگایا گیا ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا یہ اصطلاح ہندی سے لی گئی ہے لیکن اہل ہندی سے معلوم ہوا کہ وہ اس سے واقف نہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ہائیت اور اور ہائیے کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۶ع کے ہماری زبان میں پاکستان کی اصلاحاتِ املا پر ایک مضمون آیا اُس سے معلوم ہوا کہ وہاں انہیں منفموس آوازیں اور تنفیس کہتے ہیں یہ بہتر اصطلاحیں ہیں لیکن اب ہمیں ترقیِ اردو بورڈ دلی کی اصطلاحوں کو قبول کرنا ہوگا۔

اس مضمون میں ہائے ملفوظی خارج از بحث ہے۔ صرف ہکاری آوازوں اور ہائے مخلوط والے حرفوں کا تعیّن کرنا ہے ہندی میں دس ہکاری مصمتے مشہور ہیں۔ دیکھنا ہے کہ ہم انہیں پر اکتفا کریں یا چند اور ہکاری حروف کی شناخت کریں۔ آگے بڑھنے سے پہلے اردو کی ہندی زبانوں میں ہکاری مصمتوں اور حروف پر ایک نظر ڈالنا مفید ہوگا

ہند یورپی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں

«دس ہائیے قدیم ہیں جو قدیم ہند یورپی میں بھی تھے»[1]

مجھے اِس بیان کی صحت میں شبہ ہے کیونکہ سرسوتی سرن کیف نے اپنی انگریزی کتاب میں ہند جرمانی (ہند یورپی) میں حسب ذیل ہکاری مصمتے گنائے ہیں

۱ قھ (دیہاتی یعنی منھ کے کونے سے ادا ہونے والا)

۲-۳ دو قسم کے کھ (ایک غشائی دوسرا تالوئی یعنی ایک تالو کے پچھلے حصے سے اور دوسرا اگلے حصے سے ادا ہونے والا)،

۴-۵-۶ تین قسم کے گھ (ایک لہاتی، دوسرا غشائی، تیسرا تالوئی)، ۷ تھ، ۸ دھ، ۹ پھ، ۱۰ بھ۔[2]

---

(۱) ڈاکٹر شوکت سبزواری «اردو کی ہائیہ آوازیں» نقوش شمارہ ۹۸، جون ۱۹۶۳ع ص ۵۳

(2) Saraswati Saran, India's National Writing (Delhi, 1968) P. 44

ظاہر ہے یہ سنسکرت کے دس قدیم پائیے نہیں۔

اوستائی اور یونانی ۔ اردو کی حد تک یہ دونوں زبانیں غیر متعلق ہیں لیکن دلچسپی اور معلومات کی خاطر ان کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شیام سندر داس نے اپنی کتاب میں اوستائی آوازوں کی تفصیل دی ہے (ص ۴۲ ۔ ۱۴۳) ان میں کھ، گھ، پھ، تو ہماری آوازوں جیسے ہیں۔ تو جس میں قدرے فرق معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مندرجہ بالا مضمون کے مطابق اوستا نے ہند یورپی کے پانچ ہکاری مصمتے برقرار رکھے کھ، گھ، تھ، دھ، پھ، شیام سندر داس نے دھ کی جگہ ﭺ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے یہ ہکاری مصمتہ نہیں، ممکن ہے (ذ) ہو تھ کے علاوہ ہند یورپی میں تھے ہی یہ پانچ ہکاری مصمتے سبزواری کے مطابق یونانی میں صرف تین پائیے تھے کھ، تھ، پھ، (مضمون ص ۵۳)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج انگریزی میں لفظ کی ابتدا میں صرف P, T, K, کو قدرے ہکاری کرکے بولا جاتا ہے گویا یونانی نے ہند یورپی کے محض غیر مصبق ہکاری مصمتے لیے، مصبق ہکارے نہیں۔

ویدک بھاشا ۔ ڈاکٹر شیام سندر داس نے اپنی ہندی کتاب میں ویدک بھاشا میں حسب ذیل ہکاری مصمتے بیان کیے ہیں۔

کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، لھ، تھ، دھ، پھ، بھ،[1]

گویا ہندی کے دس بنیادی ہکاری مصمتوں میں ایک «لھ» کا اضافہ کیا ہے۔

سنسکرت اِشی پانینی پانچویں چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوئے ہیں۔ وہ بہت بڑے قواعد داں اور ماہر لسانیات تھے انھوں نے اپنے ۱۴ «شوسوتروں» میں سنسکرت کے جملہ مصوتوں اور مصمتوں کی طرح طرح سے گروہ بندی کی ہے۔ ڈاکٹر شیام سندر داس نے اپنی کتاب بھاشا وگیان میں یہ ۱۴ سوتر دئیے ہیں (ص ۵۱ ۔ ۱۴۹) ان میں سے سوتر نمبر ۱۱، ۹، ۸ میں ہکاری مصمتے ہیں جو ہندی کے دس مشہور ہکاری مصمتے ہی ہیں۔ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ نے بھی سنسکرت

---

۱ بھاشا وگیان (طبع سوم، بنارس ۱۹۴۴ع) ص ۱۲۶

میں یہی دس ہکاری مصمتے مانے ہیں[1] وہ مزید لکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ک، گ وغیرہ کا ایک غیر ہکاری تلفظ تھا، دوسرا قدرے زیادہ تنفس کے ساتھ جیسے انگریزی ابتدائی K ، کھ ہوجاتا ہے سنسکرت میں یہ ہکاریت نحیف تھی۔ بعد کی زمانوں میں بڑھ کر کھ، گھ کی شکل اختیار کرلی۔

سرسوتی سرن نے اپنی انگریزی کتاب میں سنسکرت میں وہی دس ہکاری مصمتے تسلیم کیے ہیں (ص ۴۸)

پالی۔ ڈاکٹر شیام سندر داس کے مطابق پالی میں سنسکرت کی دس ہکاری آوازیں محفوظ رہیں اُن پر اضافہ ہوا (ڑھ) کا۔ (ڑ) (ڑھ) پہلی بار پالی میں رونما ہوتے ہیں اس طرح پالی میں ۱۱ ہکاری مصمتے ہیں (ص ۱۵۲)

ممبئی کے سیمنار میں مرزا خلیل احمد بیگ نے کسی کے حوالے سے کہا کہ ڑ، ڑھ کی آوازیں بہت بعد کی ہیں یعنی جدید ہند آریائی ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ بابو شیام سندر داس سنسکرت کے بھی عالم ہیں، لسانیات کے بھی۔ میں ان کے قول کو غلط نہیں مان سکتا پھر بھی میں نے مشہور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر اشوک کیلکر کو لکھ کر پوچھا۔ انہوں نے میرے نام مکتوب مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۸۷ء میں لکھا کہ ویدک بھاشا میں ڈ، ڈھ کے علاوہ معکوسی ٹ (ळ) اور معکوسی لھ (ळ्ह) موجود تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ان کے بیچ کی آوازیں ڑ، ڑھ بھی رہی ہوں گی جن کی حیثیت ہم صوت (ایلوفون) کی رہی ہوگی، صوتیے کی نہیں اسی لیے اسے رسم الخط میں نہیں دکھایا گیا۔

گویا ویدک اور سنسکرت دور میں ڑھ کی آواز بولی جاتی ہوگی لیکن رسم الخط میں پہلی بار پالی میں سامنے آتی ہے۔

شورسینی پراکرت۔ شیام سندر داس کے مطابق اس میں پالی کے جملہ ہکاری مصمتے بہ شمول ' ڑھ ' ملتے ہیں (ص ۱۵۲)

شورسینی اپ بھرنش۔ اس میں ۱۲ ہکاری مصمتے تھے۔ دس بنیادی مصمتوں میں

---

۱ سامانیہ بھاشا وگیان (طبعِ ششم الہ آباد، ۱۹۶۱ء) ص ۱۰۵

محض نو ہیں "دھ، نہیں ان میں شامل کیجیے حسب ذیل
تین ژھ، بین دندانی مھ، دولبی مھ (شیام سندر داس ص ۱۵۳)

کھڑی بولی اگر شورسینی اپ بھرنس سے نہیں نکلی بلکہ اس کے پڑوس کی کسی دوسری اپ بھرنش سے نکلی ہے تو بہ گمان غالب اس میں بھی یہی ہکاری مصمتے رہے ہوں گے۔

ہندی - کیلاگ کی انگریزی کتاب "اے گرامر آف دی ہندی لینگویج" انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں لکھی گئی اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کے مطابق اس میں ہندی میں دس ہکاری مصمتوں کے علاوہ ذیل کی چھے آوازیں مزید ہیں۔

نھ، مھ، لھ، رھ، یھ، وھ
انہیں کیلاگ نے معطوفی مصمتے قرار دیا ہے۔[1]

ہندی رسم الخط میں محض دس ہکاری ہیں جو یہ ہیں
کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، تھ، دھ، پھ، بھ،

لیکن ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری نے اپنی "بھاشا وگیان" میں لکھا ہے "علما نے مانا ہے کہ ہکاریت بندشی مصمتوں ہی میں ہوتی ہے۔ یہ ماننا مناسب نہیں۔ صفیری آوازوں کے علاوہ سبھی قسموں کے مصمتوں کے غیر ہکاری اور ہکاری روپ ہوسکتے ہیں جیسے نھ، رھ، لھ، ژھ، چھ وغیرہ۔ صفیری آوازوں میں یہ امتیاز نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ہوا کے زوردار بہاؤ کی ضرورت پڑتی ہے جس کی وجہ سے وہ سب ہکاری ہوتے ہیں ہکاریت کی بنا پر ہم ہندی میں یہ ہکاری مصمتے رکھ سکتے ہیں۔

کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، تھ، دھ، نھ، پھ، بھ، مھ، لھ، رھ، ژھ،[2]

---

۱ کیلاگ ص ۱ بحوالۂ ڈاکٹر مسعود حسین خان، اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ، مترجم ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۶ع) ص ۷۶

۲ بھولا ناتھ تواری بھاشا وگیان (الہ آباد، طبعِ چہارم ۱۹۶۲ع) ص ۳۰-۳۲۹

اس طرح انھوں نے ہندی میں ۱۵ ہکاری مصمتوں کی شناخت کی ہے۔ دس قدیم مصمتوں کے علاوہ لھ، مھ، نھ، رھ، ڑھ۔ انھوں نے یھ، وھ کے حق میں شہادت نہیں دی۔

اب تاریخی ترتیب سے ایک مستشرق اور چند اہلِ اردو کے بیانات ملاحظہ ہوں۔ ان میں سے بعض نے حروف کا ذکر کیا ہے اسی سے ان کی تمثیلِ اصورت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

انشا۔ انشا کی دریائے لطافت ۱۲۲۲ھ میں مکمل ہوئی۔ ڈاکٹر عابد پیشاوری کے مطابق اس میں انشا نے اردو میں ۱۷ ہکاری مصمتے شمار کرائے ہیں۔[1] دس قدیم مصمتوں کے علاوہ سات یہ ہیں

رھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ،

پلیٹس۔ انشا کے بعد ۱۸۸۴ع میں پلیٹس نے اپنی اردو انگریزی لغت میں ۱۱ ہائیوں کا ذکر کیا ہے (مقدمہ ص ۷) ان میں دس قدیمی ہائیوں کے علاوہ ،ڑھ، بھی شامل ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی۔ اسمٰعیل میرٹھی نے ۱۸۹۲ع میں اپنا قاعدہ شائع کیا۔[2] انھوں نے بھی پلیٹس کے ۱۱ ہائیوں کو تسلیم کیا۔[3] ممکن ہے انھیں پلیٹس ہی سے تحریک ملی ہو۔

عبدالحق۔ مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو آزادی سے قبل کی کتاب ہے اس وقت ۱۹۸۶ع کا ایڈیشن پیشِ نظر ہے۔ انھوں نے اول دس کے بجائے ۱۱ سادہ ہکاری آوازوں کا ذکر کیا جن میں دس قدیم ہندی مصمتوں کے علاوہ ،ڑھ، کو بھی شامل کرلیا ہے ان کے علاوہ چار مزید رھ، لھ، مھ، نھ کا ذکر کیا گویا دس قدیم مصمتوں کے ساتھ پانچ مزید

---

۱ بحوالۂ ڈاکٹر عابد پیشاوری، انشا اللہ خان (لکھنؤ، ۱۹۸۵ع) ص ۹۵-۵۹۴

۲ ڈاکٹر سیفی پریمی، حیاتِ اسماعیل (دلی اکتوبر ۱۹۷۶ع) ص ۲۱۴

۳ ڈاکٹر ابومحمد سحر "دوچشمی ہے" رسالہ آہنگ گیا ستمبر ۱۹۸۴ع ص ۸

کو شامل کرکے ۱۵ ہکاری آوازوں کو اردو کے حروف تہجی میں شامل کرنے کی سفارش کی جس سے اردو میں کل پچاس حروفِ تہجی ہو گئے۔[1]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں ان کا انگریزی رسالہ A Pehontic and Phonological Study of the Word in Urdu سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہے اس میں ہکاری آوازوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمرے میں دس قدیم مصمتے نیز ڑھ ہیں، دوسرے میں وہ چھے جن کا ذکر کیلاگ نے کیا ہے یعنی نھ، مھ، لھ، رھ، یھ، وھ۔ لکھتے ہیں کہ موخر الذکر میں ہائیت لفظ کے ایک بڑے جزو پر پھیلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ عام "ہ" کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے۔[2]

ان کے دو پرانے مضمون ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے مرتبہ مجموعے «اردو میں لسانیاتی تحقیق» (بمبئی ۱۹۷۱ء) میں شامل ہیں۔ اپنے مضمون «اردو حروفِ تہجی کی صوتیاتی ترتیب» میں ان حروف کو دیوناگری رسم الخط نیز «بین الاقوامی انجمنِ صوتیات» کے اصولوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا ہے۔ ان کے چارٹ میں ۱۱ ہکاری حروف ہیں، دس قدیمی ہائیے گیارھواں ڑھ۔ اس کے بعد نوٹ دیتے ہیں،

«یہ ترتیب دیوناگری رسم الخط کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے جو ترتیب کے اعتبار سے مکمل رسم الخط ہے۔ (ص ۳۹)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ اس فہرست میں نھ، لھ اور مھ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن انہیں شامل نہ کرنے کی دو نحیف وجوہ دیتے ہیں، پہلی یہ

۱ مولوی عبدالحق قواعدِ اردو (انجمن ترقیِ اردو ہند نئی دلی ۱۹۸۶ء) ص ۲۷-۶

۲ اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ ص ۷۷-۷۶

کہ ان آوازوں سے گنتی کے لفظ بنتے ہیں، دوسری یہ کہ 'دلھن اور 'دلہن کا تلفظ متعین بھی نہیں (ص ۴۲ ۔ ۴۱) ان کا دوسرا مضمون ' اردو صوتیات کا خاکہ، بعد کا معلوم ہوتا ہے اس میں صرف گیارہ ہکاری مصمتے تسلیم کیے ہیں دس قدیمی مصمتے نیز ' ژھ، (ص ۸) گویا یہی ان کا آخری فیصلہ ہے ' ژھ، کے شمول کے بارے میں آگے بحث کی جائیگی۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور گیان چند۔ ان تینوں کے نظریات کو ایک ساتھ درج کیا جاتا ہے کیونکہ تینوں کی تحریریں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ میں نے ۱۹۶۱ع میں ساگر میں لسانیات کا موسم گرما کا کورس پڑھا ہی تو لسانیات پڑھی تھی، نمود کے لیے اپنی قلیل متاع کے ساتھ (جو ہنوز اسی طرح قلیل ہے) دھڑا دھڑ صوتیات کے موضوع پر لکھنے لگا۔ میں نے نقوش جولائی ۱۹۶۲ع میں ایک مضمون «اردو کی رصوت اور صوتیے» شائع کیا۔ اس میں دس قدیم ہکاری آوازوں کو مفرد آواز نیز صوتیہ قرار دیا (ص ۳۰) جب کہ مھ، نھ، لھ، رھ، ژھ، کو مرکب۔ ان پانچ پائیوں کے علاوہ بولی میں مزید تین پائیوں کا ذکر کیا ذھ یا زھ (مذہب) یھ (یہاں) وھ (وہاں) جیسا کہ آگے واضح ہوگا میرے تجزیے میں بار بار تبدیلی ہوتی ہے لیکن دس قدیمی ہکاریوں کو مفرد آواز ماننے کا خیال کبھی ترک نہیں کیا۔

میرے مضمون سے تحریک پاکر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے نقوش، ۱۹۶۳ع میں اپنے مضمون ' اردو کی ہائیہ آوازیں، میں لکھا کہ اردو کہ ہائیہ اصوات و حروف ۱۷ ہیں جن میں سے دس قدیم ہیں اور ذیل کی سات آوازیں بعد کی پیداوار ہیں

رھ، ژھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ

ان کے مطابق پہلے دس کو مفرد آوازیں اور مستقل صوتیے کی حیثیت دینے کا خیال سب سے پہلے ۱۹۲۵ع میں اُمیش چندر سین نے ظاہر کیا (ملاحظہ ہو صوتیاتی علوم کی دوسری بین الاقوامی کانفرس لندن کی روداد)۔ دس پائیوں کو مفرد اور سات پائیوں کو مرکب ماننے پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

«میں اسے ناگری تحریر اور اس سے ماخوذ خطوط کا اثر سمجھتا ہوں۔

اس کا ایک واضح اور قرینِ قیاس قرینہ ان میں سے بعض اہلِ علم کا قدیم و جدید ہائیوں میں فرق کرنا ہے ڈاکٹر گیان چند سنسکرت کے قدیم ہائیوں کو، جن کی دیوناگری میں مستقل اور آزاد شکلیں ہیں، مفرد آواز مانتے ہیں۔ بقیہ کی ناگری میں کوئی خاص شکل نہیں۔ یہ ان کے نزدیک مرکب اور مخلوط ہیں » (نقوش ص ۵۰)

انہوں نے اپنے مضمون میں زور دے کر یہی کہا کہ سنسکرت کے دس قدیم ہائیے بھی مخلوط اور مرکب آوازیں ہیں جو ایک بندشی مصمتے اور ھ کے امتزاج سے بنی ہیں۔ وہ قدیم اور جدید ہائیوں میں کوئی فرق نہیں پاتے۔ لکھتے ہیں کہ اگر قدیم ہائیے ایک کوشش اور ایک جھٹکے میں ادا ہوتے ہیں تو جدید ہائیے بھی صرف ایک کوشش اور ایک جھٹکے میں ادا ہوتے ہیں (ص ۵۳). ایک کوشش میں ادا ہونے والی آوازوں کو مخلوط ماننا ڈاکٹر شوکت سبزواری ہی کا کام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سامعہ نازک صوتیاتی فرق کی گرفت نہیں کر پاتا تھا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کتابچہ «اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو» جولائی ۱۹۶۱ع میں شائع ہوا۔ اس میں ص ۲۵ پر انہوں نے دس قدیم ہائیوں کو اردو میں خونیم کا درجہ دیا ہے ان کے علاوہ کسی دوسرے ہائیے کو تسلیم نہیں کیا۔ بعد میں انہوں نے ان کی فونیمی حیثیت سے رجوع کیا۔ اردو نامے میں ایک مضمون لکھتے ہیں

«اردو رسم الخط میں ہکار آوازوں کو چونکہ سادہ آوازوں کی علامت میں ہائے دوچشمی کے اضافے سے لکھا جاتا ہے : ب اور ھ ' بھ، ر اور ھ ' دھ، اس لیے انہیں مرکب آوازیں سمجھنے کی غلط فہمی افسوس ناک حد تک عام ہے حالانکہ یہ اعضائے صوت کی ایک ہی جنبش سے ادا ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت مرکب آوازوں کی نہیں بلکہ مفرد آوازوں کی ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں ان کی مفرد حیثیت تسلیم کی گئی ہے اور ان کے لیے الگ سے علامات مقرر ہیں۔ اردو میں ایسا نہیں ہے۔»[1]

---

۱ اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں اردو نامہ کراچی۔ شمارہ ۱۴ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ع ص ۱۱-۱۰

وہ آگے لکھتے ہیں کہ ل، م، ن، ر، ڑ، اور عوامی بول چال میں ی، و، ز، میں انضمام جزوی ہے۔ ہائے مخلوط کامل، ہائے مخلوط جزوی اور ہائے ملفوظی تینوں ایک فونیم "ہ" کی ذیلی آوازیں ہیں۔

اس کے جواب میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۵۱ بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۴ء میں ایک جوابی مضمون "اردو کے صوتیے" لکھا۔ اس میں کہا

"اردو میں م، ن، ر، ڑ، وغیرہ کے ساتھ بھی "ہ" کی آمیزش ہوتی ہے جیسے پڑھ نہا وغیرہ لیکن چونکہ یہ آمیزش سنسکرت میں نہیں اور دیوناگری حروف میں ان کے لیے الگ سے علامات وضع نہیں ہوئیں اس لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان میں اور سنسکرت کے ہائیوں میں فرق کرکے فرماتے ہیں وہاں انضمام کامل ہے یہاں جزوی۔

انضمام دونوں میں یکساں ہے۔ جس طرح "بھ" میں "ھ" کی آواز مصمتے کے بعد "جڑواں حالت میں اور کسی حد تک پہلی آواز میں ضم" ہوگئی ہے ٹھیک اسی طرح "نھ" میں "ھ" کی آواز "ن" میں منضم یعنی ملی ہوئی ہے آج تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو ان دونوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز دکھائے اور یہ بتائے کہ "بھ" میں انضمام کامل ہے اور "نھ" میں ناقص" (ص ۷۶)

حقیقت یہ ہے کہ شوکت سبزواری کی تاریخی لسانیات میں نظر تھی لیکن صوتیات میں ان کا مطالعہ بالکل ناقص تھا۔ مندرجہ بالا مضمون میں جب وہ آلم، علم، عام، آم، ہال، حال، کے جوڑوں کی بنا پر ع، ح، وغیرہ کو صوتیے کی حیثیت دیتے ہیں (ص ۷۳) تو یہ راز فاش ہوجاتا ہے کہ وہ فونیمیات کی ابجد بھی نہیں جانتے تھے انہوں نے کہاں صوتیات کا درس لیا تھا کہ صوتیاتی مشینوں کے بارے میں ایسا بلند بانگ دعویٰ کردیا انسانی نطق اور سامعہ دھوکا دے سکتا اور دھوکا کھا سکتا ہے لیکن آوازوں کی ایسی کوئی نازک سے نازک خصوصیت نہیں مشین کی گرفت میں نہ آسکے۔

جواکٹر نارنگ نے شوکت سبزواری کے جواب الجواب میں اردو نامہ، شمارہ ۲۵

بابت ستمبر ۱۹۶۶ع میں « اردو کی آوازیں » کے عنوان سے مضمون لکھا اس میں انھوں نے واضح کیا

« ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ اصرار بالکل غلط ہے کہ بھ، پھ اور ڑھ، نھ میں انضمام یکساں ہے ایسا کہہ کر وہ قاری کو گمراہ کررہے ہیں ان کی خدمت میں مودبانہ عرض ہے کہ ایسی مشین واقعی ایجاد ہوچکی ہے جس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ بھ، پھ میں انضمام کامل ہے اور نھ، ڑھ میں ناقص اس مشین کا نام سپکٹرو گراف ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کے ماہرینِ لسانیات کے نزدیک « ہ » کا انضمام کامل صرف بندشی آوازوں کے ساتھ ہوسکتا ہے اور ن، ڑ کے بارے میں شوکت سبزواری صاحب کو بھی معلوم ہے کہ یہ بندشی آوازیں نہیں۔ ناگری کے بارے میں بھی انھوں نے میرے بیان کو غلط طور پر پیش کیا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ اردو، سنسکرت یا ناگری کی باندی نہیں میں نے اپنے مضمون میں ناگری اور اردو میں کہیں سبب اور نتیجے کا رشتہ قائم نہیں کیا۔»

بمبئی کے دسمبر ۱۹۸۶ع کے سیمنار میں ڈاکٹر نارنگ نے انکشاف کیا کہ انھوں نے امریکہ میں صوتیاتی لیبوریٹری میں اسپکٹرو گرام میں مختلف ہکاری آوازوں کا فوٹو لیا دس قدیم ہکاری مصمتوں میں ہکاریت کا عکس آواز کے شروع ہی سے چھا جاتا تھا جب کہ بقیہ جزوی ہکاری مصمتوں میں ہکاریت کا عکس آواز کے وسط سے شروع ہوتا تھا اس طرح حتمی فیصلہ ہوگیا۔

میں نے مئی ۱۹۶۲ع میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں گرمائی لسانیات اسکول میں درس لیا جہاں دو اساتذہ ڈاکٹر اشوک کیلکر اور ڈاکٹر سبرامنیم کے ساتھ کئی طویل نشستوں میں اردو کی آوازوں کے تجزیے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی دلی یونیورسٹی کے رسالے اردوئے معلی، لسانیات نمبر میں ڈاکٹر نارنگ کا مضمون نظر سے گزرا۔ میں نے ان کا تجزیہ قبول کرلیا اور ہائیے مخلوط کی دس آوازوں کی فونیمی حیثیت ختم کردی۔ میرا ترمیمی موقف میرے مضمون « اردو کی آوازیں » (اردو ادب شمارہ ۳۵، ۱۹۶۱ع، ص ۵۶) میں دیا ہے۔ گو اس پرچہ میں سنہ اشاعت ۱۹۶۱ع چھپا ہے لیکن یہ بہت بعد میں آیا ہوگا کیونکہ میں نے اس میں

اپنے نقوش جولائی ۱۹۶۲ء کے مضمون کا ذکر کرکے اس سے رجوع کیا ہے اس میں میرا موقف وہی ہے جو ڈاکٹر نارنگ کا اردو نامہ شمارہ ۱۴ بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ء کے مضمون میں ہے۔ میں نے ترمیم شدہ تجزیے کو ایک بار پھر اپنے مضمون "اردو کا صوتی تجزیہ" (اساسی مطالعے، دہلی ۱۹۷۳ء) ص ۹۱-۹۰ پر پیش کیا ہے وہاں ان آوازوں کی ہکاریت کو محض ایک امتیازی وصف قرار دیا ہے جیسے کہ غنائیت ہوتی ہے۔

اب ذرا "ڑھ" پر بطورِ خاص غور کیا جائے پلیٹس اور اسمٰعیل میرٹھی نے دس قدیم ہائیوں کے ساتھ "ڑھ" کو شامل کیا تو کیا لیکن حیرت اس پر ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی ان کی تائید و تقلید میں ایسا کیا جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ثابت کرچکے ہیں کہ دس ہندی ہائیوں میں ہکاریت کا انضمام کامل ہے بقیہ پانچ یا سات میں بہ شمولِ "ڑھ" جزوی ہے۔ خود ڈاکٹر مسعود حسین خاں ڑھ کی فونیمی حیثیت سے شدو مد سے انکاری ہیں مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو میں چارٹ بناکر ڈھ اور ڑھ کو ایک فونیم کی ذیلی آوازیں قرار دے چکے ہیں۔[1] مصمتوں کے اپنے چارٹ میں یا تو انہیں محض دس ہکاری مصمتے درج کرنے چاہئیں تھے جنہیں بہت سے حضرات فونیم مانتے ہیں یا فونیم کو نظر انداز کرکے ۱۵ یا ۱۷ ہکاری مصمتوں کو شامل کردیتے جزوی ہکاری مصمتوں میں سے محض ڑھ کو چن لینا سمجھ میں نہیں آتا یقیناً یہ اسمٰعیل میرٹھی اور مولوی عبدالحق کے زیرِ اثر کیا گیا ہوگا۔

ممبئی کے سیمنار میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ریڈر شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی نے دعویٰ کیا کہ "ڑھ" اردو میں فونیم ہے کیونکہ "بڑا" اور "بڑھا" جیسا اقلی جوڑا ملتا ہے اس سلسلے میں میرے دو معروضات ہیں۔

۱۔ کسی آواز کو فونیم کا درجہ دینے سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ مفرد آواز ہے ڈاکٹر نارنگ نے اسپیکٹروگراف سے یہ طے کیا کہ ڑھ میں ڑ اور ہکاریت کا انضمام جزوی ہے یعنی یہ دو نہ سہی کم از کم ڈیڑھ آواز کے

---

۱ سرسید بکڈپو علی گڑھ، طبعِ ششم ۱۹۷۸ء ص ۲۱۳

برابر ہے اب کوئی دوسرا بڑا ماہر صوتیات لیبوریٹری میں تجزیہ کرکے طے کرے کہ ڑھ بھی ڈھ کی طرح مفرد آواز ہے تو میں اس فیصلے کو قبول کرلوں گا ۔

۲۔ اگر ڑھ کو مفرد آواز مان کر فونیم کا درجہ دیتے ہیں تو نہ صرف دس قدیمی ہائیوں کو بلکہ دوسرے پانچ حروی ہکاریت والے مصمتوں کو بھی اس اعزاز سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ فونیمی حیثیت دینے کے لیے اقلی جوڑا حتمی ہوتا ہے لیکن یہ اگر نہ ملے تو مماثل جوڑا بھی کام دے جاتا ہے اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ دو آوازیں مماثل ماحول میں آکر مختلف معنی دیتی ہیں۔ اب کچھ نمونے ملاحظہ ہوں :

مھ۔ اس کا تضاد کمھار اور کمار میں ہے جس منطق کے تحت بڑا اور بڑھا کے سبب ڑھ کو فونیم کہا جارہا ہے اسی منطق سے مھ بھی فونیم ہوجائیگا۔

لھ۔ آلھا اور آلہ کا اقلی جوڑا ملتا ہے مماثل جوڑے کی مثال حسب ذیل ہے

گھر گھر ہیں مٹیالے چولھے بیل گاڑی میں بدن کی چولیں ہل گئیں

نھ۔ مغربی یوپی میں گنگا اشنان کے میلے کو عام بول چال میں ' نھاں ' کہتے ہیں، نھاں کہنا بڑا تکلف ہے ۔ گڑھ مکتیشور کے نھان کے میلے کا تضاد دان سے ہوسکتا ہے مزید دیکھیے جن کی جمع جنوں سے تضاد

جنھوں نے تمھیں تکلیف پہنچائی ان پر لعنت

جنوں نے تمھیں تکلیف پہنچائی ان پر لعنت

رھ۔ سرھانا ڈور کا سرانا ملا

لیکن میں نہ لھ، مھ، نھ، رھ کو فونیمی حیثیت دینے کے حق میں ہوں نہ 'ڑھ' کو کیونکہ میری ناقص رائے میں اردو میں دس، ۱۱، ۱۵، یا ۱۷ فونیموں کے اضافے کی کوئی ضرورت نہیں۔

رشید حسن خاں رشید حسن خاں کی ضخیم عالمانہ کتاب ' اردو املا، مئی ۱۹۷۴ع

میں ترقی اردو بورڈ سے شائع ہوئی ہے اس میں انھوں نے
ہائے مخلوط کے مسئلے پر بڑی ہوشمندی اور سلامت الطبعی
سے نظر ڈالی ہے ۔ لکھتے ہیں

" صوتیات کی رو سے آواز اصل چیز ہے ، اور اسی اصول کے تحت زبان کے نظام اصوات کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے ۔ مگر اردو میں ، عربی فارسی کے اثر سے ، حرف کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے ، اور یہ تصور جاگزیں ہوچکا ہے صوتیات کی رو سے ، ایک آواز کے لیے دو علامتیں نہیں ہوسکتیں ، مگر حروف کی بنیاد پر ایسا ہوسکتا ہے اور اردو میں یہی صورت ہے " (ص ۳۱۹)

" علمی سطح پر سچائی صوتیات کے پاس ہے اور اُس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا ۔ مگر عملی سطح پر روایت چھائی ہوئی ہے اور اس کو بھی آسانی کے ساتھ نہ توڑا جاسکتا ہے اور نہ چھوڑا جاسکتا ہے بہت سے قاعدے قانون ، روایت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں ہائے مخلوط کے سلسلے میں بھی قاعدے اور روایت کا اختلاف نظر آتا ہے اور یہ اختلاف بھی ، حرف اور صوت کے اسی اختلاف پر مبنی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے صوتیات کے قاعدے کے مطابق بھ ، تھ وغیرہ مفرد آوازیں ہیں ، مگر روایت کی رو سے (جو حرف کے تصور پر مبنی ہے) یہ مرکب آوازیں ہیں جو ب اور ھ اور ت اور ھ کے اتصال سے وجود میں آتی ہیں " (ص ۳۲۰)

" ب اور ھ کی مستقل شکلوں کے باعث اردو والوں کا ذہن (بھ) کی ایک آواز کو دو ٹکڑوں کے میل کا نتیجہ سمجھتا ہے ؛ صوتیات کا کہنا برحق ، مگر روایت کے اس اثر کا علاج بہت مشکل ہے اردو میں بھی پہلے سے ، ان آوازوں کے لیے مفرد شکلیں ہوتیں ، تو شاید یہ صورت پیدا نہیں ہوپاتی " (ص ۳۲۲)

انھوں نے روایت اور صوتیات کے نقاطِ نظر کا فرق بڑے معروضی ڈھنگ سے پیش کیا ہے ۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ روایت اور صوتیات میں سمجھوتا کرکے درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے اختلاف اِس پر رہے گا کہ کس حد تک روایت کا اِتباع کیا جائے اور کہاں کہاں صوتیات کا رشید حسن خاں اردو میں

دس قدیم پکاری آوازوں کے علاوہ دوسری چھے پکاری آوازوں کو شامل کرتے ہیں۔

«اردو میں ہائے مخلوط والی آوازیں اور ان کی تحریری صورت یہ ہے۔
بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ،
نھ، یھ» (ص ۳۲۳)

یھ اور وھ کی آوازیں ایک ساتھ کی ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ یھ کو کلیجے سے لگاتے ہیں اور وھ کو دتکار دیتے ہیں لکھتے ہیں۔

«یہاں، وھاں میں بھی ہائے مخلوط ہے، مگر اب یہ صورتیں متروک ہیں اور ان کی جگہ یہاں، وہاں اور یاں، واں بولتے اور لکھتے ہیں مگر یھ کی صورت (صوت ؟) کو بھی شاملِ فہرست ضرور کیا جائے گا۔ آواز تو بہ ہر طور ہے، اور آیندہ بعض اور الفاظ میں بھی اس کا دخل ہوسکتا ہے۔» (ص ۳۲۲)

میری رائے میں معیاری الفاظ یہاں، وہاں کے علاوہ بول چال میں یھاں وھاں بولنے کا رواج عام ہے۔ میں نے کسی کو یاں، واں بولتے نہیں سنا۔ غالب تو اس معاملے میں اتنی شدت برتتے تھے کہ یہاں، وہاں اور یاں، واں کو غیر فصیح سمجھتے تھے اور محض یھاں، وھاں کو فصیح جانتے تھے۔ عرشی صاحب نسخۂ عرشی کے حواشی شرحِ غالب میں لکھتے ہیں کہ غالب نے یوسف علی خاں کے مصرع :
سیاح جہاں گرد ہیں، آنکلے یہاں بھی، پر اصلاح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

«یہاں، بروزن دہاں فصیح نہیں ہے ضرورت نہ چاہیے۔ یھاں بہ ہائے مخلوط التلفظ افصح ہے» (نسخۂ عرشی طبعِ اول ۱۹۵۸ء، ص ۳۱۸)

لیکن انتخابِ غالب میں کاتب نے وہاں، لکھا تھا۔ غالب نے اپنے قلم سے تصحیح کر کے اسے «وہاں» بنادیا جس سے عرشی صاحب نے نتیجہ نکالا کہ آخر میں غالب اس لفظ کو بغیر ہائے مخلوط بولنے لگے۔ اس طرح یھاں، وھاں کو فصیح ماننے والا تنہا وکیل بھی نہ رہا۔

املا نامہ «اردو املا کے ساتھ ساتھ ترقی اردو بورڈ نے سن ۱۹۷۴ء ہی میں

اپنا "املا نامہ" شائع کیا۔ اس میں املا کمیٹی کی سفارشات ہیں اس کمیٹی میں ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں تھے۔ املا نامہ میں لکھا ہے۔

"یہ واقعہ ہے کہ پھ، بھ، تھ، دھ، لھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ اور ڑھ اردو کی بنیادی آوازیں ہیں۔ نیز رہ، لھ، مھ، نھ اور یھ میں بھی ہکاریت کا شائبہ ہوسکتا ہے" (ص ۶۰)

دس ہکاری آوازوں کے ساتھ ڑھ کو بھی اسی درجے میں شامل کرنا مولوی عبدالحق کا اثر ہے۔ "یھ" کو لینا اور "وھ" کو نظر انداز کرنا کمیٹی کے ایک رکن رشید حسن خاں کے اصرار پر کیا گیا ہوگا کیونکہ آخر الذکر کی کتاب میں یوں ہی کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ابومحمد سحر، ان کا مضمون "دوچشمی ہے" رسالہ آہنگ گیا بابت ستمبر ۱۹۸۴ع میں شائع ہوا۔ وہ شوکت سبزواری کو ماہر صوتیات سمجھ کر ان کے اردو نامے کے مضامین سے متاثر ہیں وہ دس بندشی ہائیوں اور سات غیر بندشی ہائیوں کو مساوی درجہ دیتے ہیں (آہنگ ص ۸) اور اعتراض کرتے ہیں کہ محض اول الذکر دس کو مفرد اور آخر الذکر سات کو مرکب ماننا دیوناگری رسم الخط سے مرعوبیت کے سبب ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر نارنگ کا جوابیہ مضمون "اردو کی آوازیں" مشمولۂ اردو نامہ، شمارہ ۲۵، ستمبر ۱۹۶۶ع نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر نارنگ اور میں دیوناگری سے کسی مذہبی جذباتی وابستگی کے سبب مرعوب نہیں بلکہ اس کی صوتی خوبیوں کے معترف ہیں ڈاکٹر مسعود حسین خاں تو اردو حروف تہجی کو دیوناگری کے مطابق ترتیب دینے کو آمادہ ہیں کیونکہ ان کی رائے میں دیوناگری ترتیب کے اعتبار سے مکمل رسم خط ہے۔

ناگری حروف کی قدر شناسی کے لیے صوتیات کی ابتدائی معلومات ضروری ہے۔ میں نے اپنی کسی سابق تحریر میں لکھ دیا ہے کے ناگری حروف کی گروہ بندی رشی پاننی نے کی، یہ درست نہیں۔ دیوناگری خط آٹھویں صدی عیسوی کے قریب ظاہر ہوا۔ یہ براہمی خط سے نکلا ہے جس کا قدیم ترین مستند کتبہ چوتھی

صدی قبل مسیح میں ملتا ہے دیوناگری حروف کی ترتیب براہمی حروف کے مطابق ہے۔ براہمی کے مختلف حروف یا آوازوں کی ترتیب پانن کے رسالے میں بیان کردہ مخارج کی بنا پر کی گئی ہے پانن نے اپنے سوتروں میں آوازوں کی طرح طرح سے گروہ بندی کی ہے جس کی باریکیوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس نے مصمتوں میں نہ صرف ہکاریت اور انفیت (غنّائیت) کو پہچانا بلکہ حیرت پر حیرت یہ ہے کہ مصیتیت تک کو پہچان لیا یہ حلقوم میں صوتی تاروں میں پیدا ہوتی ہے جسے کسی طرح آلوں کی مدد کے بغیر نہیں دیکھا جاسکتا۔ اسی کی بنا پر پ، ت، ک، وغیرہ بالترتیب ب، د، گ سے الگ آوازیں طے پاتی ہیں۔ آج کل تو یہ آلات کی مدد سے دریافت کرلیا گیا لیکن یہ کرامت ہے کہ پانن نے پانچویں چوتھی صدی ق م میں ان کا ادراک کرلیا۔ امریکہ کے ایک بڑے ماہر صوتیات گلیسن نے اپنی مشہور کتاب کے دیباچے میں پانن کے رسالے کو A Morument of Human Intelligences قرار دیا ہے۔[1]

ڈاکٹر نارنگ نے اسپکٹروگرام کے ذریعے ثابت کردیا ہے کہ ہکاریت دس بندشی مصمتوں میں کامل ہے غیر بندشی مصمتوں میں جزوی ہے۔ ہم لیبوریٹری میں نہیں جاسکتے۔ نطق و سامعہ کی مدد سے کچھ فیصلہ کرلیں۔ واضح ہو کہ آوازوں کے نازک صوتیاتی فرق کا ادراک کرنے کے لیے ذکی الحس سامعے کی ضرورت ہوتی ہے ذرا توجہ مرکوز کرکے کئی بار یہ فرضی الفاظ منھ سے ادا کیجیے

ا اَپھ، اَکھ، اَلھ،

ب اَمھ، اَنھ، اَلھ، اَرھ،

ذکی الحس کان کو معلوم ہوجائے گا کہ ا کے آواز میں ہکاری آواز مفرد معلوم ہوتی ہے جب کہ زمرہ ب کے الفاظ میں م، ن، ل، ر، کے بعد گردن ٹوٹ جاتی ہے اور ہائے مخلوط کے لیے کوشش کرکے بات آگے بڑھانی ہوتی ہے م، ن، ل، ر وغیرہ ھ کے ساتھ شیر و شکر نہیں ہوتے۔ ان کی ھ کے بعد ایک خفیف سا مصوتہ اَ بولنا ہوتا ہے۔ ان کی ھ لسانیاتی اصطلاح میں Syllabic Consonant کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔

1 Gleason, An Introduction to Descriptive Linguistics, ed 968

جزوی ہکاری مصمتوں میں آواز کی ثنویت جس طرح انفی مصمتوں (م، ن) میں کھل کر سامنے آتی ہے اس طرح دوسرے مصمتوں میں نہیں۔ کسی مشین کے بغیر محض مشاہدے سے ثابت ہوجائے گا کہ ان دونوں آوازوں کے ساتھ ہکاریت شیر و شکر نہیں ہوتی ملاحظہ ہو

ا، م، ن، ان دونوں کے ادا کرنے میں منہ کا راستہ بالکل بند ہوجاتا ہے اور ہوا ناک کے راستے نکال جاتی ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ سب مصمتے بہ شمول (ہ)، منہ کے راستے ادا ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت دوچشمی ھ کی ہے۔ یہ ناک سے ادا ہونے والے مصمتے کے ہمراہ نہیں، متعاقب ہی سے ادا ہوسکتی ہے۔ پہلےم، ن کو ادا کرنے کے لیے منہ کا راستہ بند کرکے ناک کا راستہ کھولنا ہوگا۔ اس کے بعد ھ ادا کرنے کے لیے ناک کا راستہ بند اور منہ کا راستہ کھولنا ہوگا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے نقوش شمارہ ۹۸ بابت جون ۱۹۶۳ع میں ایک مضمون "اردو کی ہائیہ آوازیں" شائع کیا اس میں انھوں نے آخری ص ۵۴ پر ایک لفظ "تمھ" درج کیا ہے۔ یہ لفظ ہمارے لیے بہت اہم اور کلیدی ہے۔ آئینے میں دیکھ کر ایک بار "تم" کہیے۔ م دولبی صوت ہے اسے ادا کرنے کے بعد ہونٹ بند رہیں گے کیونکہ سانس ناک سے خارج ہوتا ہے پھر "تمھ" کہیے اور آئینے میں دیکھیے۔ م کو ادا کرتے وقت ہونٹ بند رہیں گے اور اس کے بعد ھ کو ادا کرنے کے لئے کھل جائیں گے جو اس کا واضح ثبوت ہے کہ مھ مرکب آواز ہے یہی کیفیت نھ کی ہے۔

میں نے امکان بھر یہ واضح کردیا کہ ہندی کی دس ہکاری آوازیں فونیم نہ سہی، مفرد آوازیں ضرور ہیں، جب کہ غیر بندشی ہکاری مصمتے مفرد نہیں مرکب ہیں۔ اگر وہ دو آوازوں کے برابر نہیں تو ایک آواز سے زیادہ اور دو سے کم ہیں۔ اب ان کی صوتی حیثیت بھول کر غور کیا جائے کہ کیا ان میں کسی کو یا سب کو اردو کے حروف تہجی میں جگہ دی جائے۔ یہ معاملہ محض علمی نہیں رہ گیا بھے اس میں کچھ نفسیاتی گرہیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک طرف اہل روایت ہیں دوسری طرف اہل صوتیات۔ اہل روایت میں بھی دو زمرے معلوم ہوتے ہیں ایک

تو وہ جو صدق دل سے سمجھتے ہیں کہ قدیم زمانے سے حرف و صوت کا جو چلن چلا آرہا ہے وہی صحیح ترین ہے اہل صوتیات کو اس کی تحزیب کا کوئی حق نہیں مجھے شبہ ہوتا ہے کہ روایت پرستوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اہل صوتیات کی تجویزوں کی محض اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ خود صوتیات سے نابلد ہیں اور ان تجویزوں کو دوسرے پیش کررہے ہیں جو کچھ وہ (روایت پرست) نہیں جانتے کیوں نہ اسے محض تخریب و انہدام قرار دیا جائے۔

اہل صوتیات بھی ایک نفسیاتی خوف کے اسیر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دل سے تو طرح طرح کی اصلاحات کرنا چاہتے ہیں لیکن اہل روایت کی زبردست لابی (Lobby) سے ہراساں ہوکر اپنی اصلاحات کو لگام دیتے ہیں اور حروف کی حد تک ہائے مخلوط کے معاملے میں اہلِ روایت کی بولی بولنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے یہ نفسیاتی پیچاک میرا وہم ہو لیکن مختلف نظریوں کے وکلا کی جذباتیت دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ابتدائی قاعدے کا مقصد طفلِ مکتب کو اردو رسم خط سے آشنا کرنا ہے اسے صوتیات کا درس دینا نہیں۔ اردو کے ابتدائی قاعدے کو صوتیاتی صحت پر تدریسی سہولت کو ترجیح دینا چاہیے۔

املا اور حروف کے معاملے میں اہل صوتیات میں سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کافی غور کیا ہے اور لکھا ہے ڈاکٹر نارنگ نے تو ابتدائی درسی کتابیں بھی تیار کی ہیں۔ اہل روایت میں ڈاکٹر رشید حسن خاں اور ڈاکٹر ابومحمد سحر نے اس موضوع میں ڈوب کر جس شرح و بسط اور عمقِ نظر سے جائزہ لیا ہے اس کے باعث یہ موضوع انہیں کا ہوکر رہ گیا ہے۔ مجھ جیسا سرسری نویس کسی درانداز کی طرح گھڑی آدھ گھڑی کے لیے اس حلقۂ درس میں گھس آتا ہے بہرحال دیکھتا ہوں کہ ہندی کے دس ہکاری بندشیوں کے علاوہ مزید سات ہکاری مصمتوں کے بارے میں اہل الرائے کی کیا رائے ہے۔

انشا نے ۱۷ ہائیوں کو تسلیم کیا ہے اور اسمعیل میرٹھی[1] نے ۱۱ ہی کو

۱۔ اسماعیل میرٹھی کا قاعدہ بحوالۂ ڈاکٹر ابو محمد سحر "دو چشمی ہے" رسالہ آہنگ، گیا ستمبر ۱۹۸۴ء ص ۸

لیا ہے۔ دس قدیمی ہائیے نیز ڑھ، مولوی عبد الحق نے ۱۵ ہائیوں کا ذکر کیا ہے انہوں نے یھ، وھ کو نہیں لیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے دونوں مضمونوں میں اسمٰعیل میرٹھی کی طرح دس بندشیوں کے ساتھ ڑھ کو شامل کر کے ۱۱ ہائیوں کی شناخت کی ہے۔ ڈاکٹر سبزواری جملہ ۱۷ حروف کو شامل کرتے ہیں۔

رشید خاں نے اپنی کتاب اردو املا میں لکھا ہے

> «بہر طور اردو میں ہائیے مخلوط والی آوازیں اور انکی تحریری صورت یہ ہے بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ، یھ» (ص ۲۲۳)

یہ ۱۶ آوازیں ہیں جن میں سے (وھ) کو خارج کردیا ہے۔ ان کی عبارت میں (تحریری صورت) سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ وہ اردو میں ۱۶ ہکاری حروف تسلیم کرتے ہیں لیکن ممبئی کے سیمینار دسمبر ۱۹۸۶ع میں انہوں نے کہا کہ وہ حروف تہجی میں محض ھ پر قانع ہیں اسکے علاوہ ہائیہ حروف کو شامل کرنے کے موید نہیں چونکہ انکا یہ موقف ان کی کتاب (اردو املا) کی تحریر سے مختلف تھا اسلیے میں نے بعد میں خط لکھ کر ان سے وضاحت چاہی انہوں نے مجھے ۵ جنوری ۱۹۸۷ع کے خط میں لکھا

> «ھ کو حروف تہجی میں شامل کرنے کا میں موید نہیں، میں اس کے خلاف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ (ہ) کی ایک شکل ہے، علاحدہ کوئی حرف نہیں۔ میں نے جلسے میں یہ نہیں کہا تھا کہ ھ کو حروف تہجی میں جگہ دوں گا شاید کچھ گڑبڑ کہیں ہوگئی ہے۔۔۔ بہرحال میرا خیال یہ ہے کہ ھ کو شامل حروف تہجی کرنا ضروری نہیں۔»

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ذہن میں ۱۶ ہائیہ آوازیں ہیں جنھیں وہ (ہ) کی ایک ذیلی شکل ھ کے شمول سے لکھنا پسند کرتے ہیں حروف تہجی میں نہ ھ کو جگہ دیں گے نہ ۱۶ ہائیہ حروف کو۔

املا نامہ :- ترقی اردو بورڈ کے املا نامہ میں معاملہ کچھ گول مال ہے اس کے پردے میں رشید حسن خان بولتے نظر آتے ہیں لکھا ہے

«اردو میں ہکار آوازوں کا پورا سیٹ موجود ہے اردو میں ان کے لیے اگرچہ الگ سے حروف نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ پھ، بھ تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ، اور ڑھ اردو کی بنیادی آوازیں ہیں، نیز رھ، لھ، مھ، نھ اور یھ میں بھی ہکاریت کا شائبہ ہوسکتا ہے۔ اردو میں ان کے لیے اگر ہائے مخلوط کو مخصوص نہ کردیا جائے تو ایک طرح کی بے راہ روی پھیلتی ہے۔ (ص ٦٠)»

گویا رشید حسن خان کی طرح ١٦ آوازوں کو ہائے مخلوط سے لکھا جائے اب یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ ١٦ حروف یا ہائے مخلوط اردو حروف تہجی میں جگہ پائیں گے یا نہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ- انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے

«ضروری ہے کہ ہائے دو چشمی کا استعمال ہائے مخلوط کامل اور ہائے مخلوط جزوی سے مخصوص کردیا جائے »[1]

ہائے مخلوط کامل سے ان کی مراد دس قدیم ہائیے ہیں۔ اور ہائے مخلوط جزوی سے مراد مزید پانچ آوازیں لھ۔ مھ، نھ، رھ، ڑھ ہیں انھوں نے این سی آر ٹی کے لیے جو پہلی کتاب تیار کی ہے اس میں تدریسی روایات اور سہولت کے پیش نظر (ھ) کے علاوہ ھ کو بھی شامل کیا ہے تمام حروف درج کرنے کے بعد سطر کھینچ کر نیچے ١٥ ہائیہ حروف درج کردیے ہیں جس سے وہ ان کا وجود تو تسلیم کرتے ہیں لیکن انھیں حروف تہجی میں شامل کرکے حروف کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ درسی کتاب کے علاوہ وہ اساتذہ کو ایک Teacher's guide بھی فراہم کریں گے جس میں صورت حال واضح کردی جائے گی

١- اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں، اردو نامہ، شمارہ ١۴، اکتوبر تا دسمبر ١٩٦٣ء ص ١٣

ڈاکٹر ابو محمد سحر - ان کی رائے کم و بیش رشید حسن خاں سے ملتی ہے وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں

"دو چشمی ہے (ھ) کی مخلوط یا ملواں شکلیں حروف تہجی میں شامل نہیں ہیں۔ یہ دو دو حرفوں کے مجموعے ہیں۔ انھیں حرف تہجی میں یا قاعدے میں کہیں اور، مفرد حرف کی طرح درج نہ کرنا چاہیئے"[1]

میرے نام ۳ دسمبر کے خط میں لکھا

"میری رائے میں ہائیت کے لیے سادہ حروف کو دو چشمی ہے کے اشتراک سے لکھے کا طریقہ نہایت مناسب ہے۔ مفرد حروف تہجی قرار دینے سے خواہ مخواہ حـــروف تہجی میں اضافہ ہوگا اور سب آوازیں نہ لی جاسکیں تو وہی بات ہوگی جو لھ، مھ، نھ وغیرہ کے سلسلے میں دیوناگری میں ہے"

یعنی اگر ہائیہ حروف کو شامل کیا جائے تو محض دس کو نہیں بقیہ سات کو بھی، لیکن مزید ۱۷ حروف کے اضافے سے بچوں کے ذہن میں الجھن ہوگی۔ میرے نام ۲۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کے خط میں پھر لکھا۔

"میں صوتیاتی اعتبار سے ۱۷ ہائیے مانتا ہوں لیکن ان کی تحریری علامتوں کو دو حرفوں کا مجموعہ سمجھتا ہوں مفرد حروف نہیں"

اب صورت یہ ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رشید حسن خان اور ڈاکٹر ابو محمد سحر بالترتیب ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ ہکاری حروف مانتے ہیں لیکن تینوں میں کوئی بھی انھیں حروف تہجی میں جگہ دینے کے حق میں نہیں تاکہ حروف کی تعداد میں اضافہ نہ ہو مثالی رسم الخط میں ایک آواز کے لیے ایک حرف اور ایک حرف کی ایک آواز ہونی چاہیے لیکن مروجہ رسوم الخط میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ اگر ایک آواز کو دو حروف سے ادا کیا جاتا ہے تو اسے digraph کہتے ہیں جس کی بہترین مثال رومن خـــط میں چ (Ch) اور ش (Sh) کی ہے یہ آوایں انگریزی کے فونیم ہیں لیکن انھیں رسم خط میں دوہرے حروف سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ہجا کے حصے نہیں۔ صوتیاتی اعتبار سے یہ طریق کار مستحسن نہیں

---

۱ اردو کے قاعدے، نیا دور، لکھنؤ، جون جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۱۶

لیکن روایت اور سہولت کے اعتبار سے جائز ہے۔ اردو میں بھی ۱۵، ۱۶ یا ۱۷ آوازوں کو دوہرے حروف سے لکھا جائے گا تاکہ ان کی ادائیگی بھی ہوجائے اور انہیں حروف تہجی میں شامل بھی نہ کیا جائے۔

حروف تہجی کے بارے میں سب کی رائے دینے کے بعد میری خود کی کیا رائے ہے۔ میرے لیے یہ سوال گھبرا دینے والا ہے کیونکہ میں نے درسی کتابوں بالخصوص ابتدائی قاعدے کے بارے میں غور نہیں کیا۔ یہ میرا موضوع نہیں۔ اسے تدریسی کالجوں والے ہی بہتر طریقے طے سے کرسکتے ہیں۔ این سی آر ٹی کی ورک شاپ نے لمبے غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد جو کچھ طے کیا ہے اسی کو تسلیم کرلینا چاہیے۔ اس کی آخری شکل ابھی سامنے نہیں آئی لیکن وہی طریقہ بہترین ہے کہ ہائیہ حروف کو حروف تہجی میں جگہ نہ دی جائے بلکہ جملہ حروف کے بعد سطر کھینچ کر دوسرے جزو یا دوسرے سبق کے طور پر عنوان دیا جائے۔

(ہ) کی شکل ھ کے حروف

اور اس کے نیچے ۱۵ یا ۱۶ یا ۱۷ ہکاری حروف کی تقطیع دی جائے۔ پندرہ حروف کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں صرف یھ وہ مشکل پیدا کرتے ہیں۔ پھر محض ایک متروک اور غیر معیاری لفظ (یھاں) ملتا ہے۔ وہ اس قسم کے لفظ (وھاں) میں ہیں۔ اسکے علاوہ یہ انگریزی کے ایسے دخیل لفظ وھیل (پہیا) میں موجود ہے جس کے لیے اردو میں کوئی دوسرا لفظ نہیں۔ پھر ہم کبھی انگریزی کے یہ الفاظ بھی اردو میں لکھنے پر مجبور ہوسکتے ہیں۔

وھائٹ ہاؤس، بلیک اینڈ وھائٹ، اے ایچ وھیلر کی ریلوے بک اسٹال۔ ان کی خاطر "وھ" کو شامل کرنا چاہیے۔ یھ کو حذف کیا جاسکتا ہے۔ غالب کے کسی شعر میں "یھاں" لکھنے کی ضرورت آئے تو وو آگے کی جماعتوں کے لیے ہوگا۔

ڈاکٹر ابومحمد سحر کے مضمون اردو کے قاعدے، مشمولہ، نیا دور بابت جون جولائی ۱۹۸۵ع کے مطالعے سے نیز اکتوبر ۱۹۸۶ع میں ان سے ملاقات کے دوران

اس مسئلے کا ایک اور پہلو سامنے آیا وہ ہے ابجد خوانوں کو تدریس کے وقت حروف، بالخصوص ہکاری حروف کے ہجے کا ہمیں جو حل پیش کرنا ہے اس میں بچے کی سہولت اور صحت دونوں کا کچھ نہ کچھ خیال رکھنا ہوگا۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ حرکت کا اعلان اس حرف کے بعد کیا جائے گا جس پر وہ واقع ہے یا اس کے بعد کے ساکن حرف کے بعد۔ چلن دوسری صورت کے مطابق ہے

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا

"اردو حروف تہجی میں یہ مرکب آوازیں تصور کی گئی ہیں اور اسی بنا پر اردو تدریس کا یہ انداز ہنوز جاری ہے کہ گ - ھ - ر زبر گھر - ب - ھ - ر زبر بھر جو صوتیاتی نقطۂ نظر سے مہمل ہے کہ مبنی ہے حرف کے تصور پر"

ڈاکٹر ابومحمد سحر بھی ہجے کے اس طریقے پر اصرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مصلحین کی عنایت سے ہجے کا ایک اور طریقہ نکلا ہے۔ اس کے مطابق اب کے ہجے "الف ب زبر اب" کے بجائے "الف زبر ب اب" کیے جاتے ہیں اس کی منطق یہ ہے کہ اب میں زبر الف پر ہے، اس لیے زبر الف کے بعد کہنا چاہیے نہ کہ بے کے بعد۔ یہ منطق بے جان نہیں لیکن پرانے طریقے کے مطابق جب الف بے زبر اب کہتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ زبر الف پر ہے اور بے ساکن ہے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ زبر الف اور بے دونوں پر ہے"
(نیا دور ص ۱۲)

"گھر" کے ہجے وہ یوں تجویز کرتے ہیں
"کاف دوچشمی ہے رے زبر گھر"

میرے استفسار کے جواب میں رشید حسن خاں نے بھی بالکل یہی باتیں کہیں یعنی یہ تسلیم کہ حرکت تو اسی حرف پر رہے گی جس پر وہ اصلاً واقع ہے لیکن ہجے میں بعد کے ساکن حرف کے بعد بولنا چاہیے (۲) گھر کے ہجے میں "گاف ہے رے زبر گھر" کہوں گا کیونکہ دوسری صورت میں اجنبیت محسوس ہوگی۔

مجھے اس کے برخلاف محض دومثالیں ملیں ایک یہ کہ پاکستان ٹیلی وژن پر عربی کی تدریس کی جاتی ہے اس میں پہلے مثلاً 'ب ر زبر بر' کہا جاتا تھا جو بعد میں 'ب زبر رے بر' کہا جانےلگا واضح ہو کہ بر فارسی لفظ ہے ٹی وی کا صحیح لفظ مجھے یاد نہیں دوسرے یہ کہ بمبئی کے ایک صاحب پروفیسر محمد واصل نے ایک قاعدہ لکھا ہے جس میں انہوں نے 'ب زبر ر بر' کا طریقہ اپنایا ہے۔ میں اس پر مصر ہوں کہ حرکت جس حرف پر ہے اسی کے بعد بولی چاہیے

معلوم نہیں قدیم انداز سے جگر کے ہجے کیونکر کیے جائیں گے
ج گ زبر جگ رے زبر جگر

اب دیکھیے گ جس پر دراصل زبر ہے روایتی ہجے میں زیر کا حامل بن جاتا ہے یہ جھوٹ بولنا ہے۔ "مـ کامل" میں روایتی طریقے سے پہلے لفـــظ کے ہجے کیوں کر ہوں گے

م ہے زبر زیر مـِ

کیا لغویت ہے۔ صحیح صورت حال کے مطابق ان الفاظ کے ہجے یوں کیجیے

ج زیر، گ زبر ر ِجگر م زبر ہے زیر مـِ

اگر اب تک ہجے میں آوازوں کی غلط ترتیب پیش کی گی ہے تو مستقبل میں بھی غلطی کو جاری رکھنے پر اصرار کیوں کیا جائے؟ اجنبیت کا احساس کسے ہوگا جو نیا بچہ نئے طریقے سے ہجے سیکھے گا وہ پرانے طریقے سے آشنا ہی نہیں، اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ مجھے اس موقع پر یہ شعر یاد آتا ہے

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

جہاں تک گھر کے ہجے کا سوال ہے میرے نزدیک اصل حروف کی تقطیع کے بعد دوسرے جزو میں ہائے مخلوط کے جو حروف دئیے جائیں گے انہیں ثانوی حروف کا درجہ دینا چاہیے۔ گ ہ کے بجائے گھ کہنے میں سہولت بھی ہے اور صحت بھی۔ میں تو گھر کے ہجے گھ رے زبر گھر، کرنا پسند کروں گا لیکن چونکہ اس شعبے کے ماہرین این سی ای آر ٹی والے ہیں انہوں نے اپنی پہلی کتاب کے ساتھ کے گائڈ میں جو طریقہ اپنایا ہوگا میں اسے قبول کرکے بات ختم کروں گا۔ مجھے معلوم نہیں گائڈ نے اس ضمن میں کیا ہدایت دی ہے۔

●

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
دہلی یونیورسٹی، دہلی-۶

شیخ سعدی شیرازی اور خواجہ نظام الدین اولیاء

بعد از وفات، تربت ما در زمین مجوی   درسینہ‌ہائی مردم عارف مزار ماست

خواجہ نظام الدین اولیاء (متوفی ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ع) اور شیخ سعدی کے درمیان جو تعلق خاطر تھا، اس کا مطالعہ نہ صرف تاریخی اہمیت کا حامل ہے بلکہ فارسی ادب کی تاریخ کے ایک اہم پہلو کا آئینہ دار بھی ہے۔

ہندستانی مشایخ کی ملفوظات میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات فوائدالفواد کو جنہیں چشتی سلسلۂ تصوف کا لایحۂ عمل قرار دیا گیا ہے [1] اولیت زمانی کا فخر بھی حاصل ہے۔[2] فوائدالفواد کے حتیٰ سرسری مطالعے ہی سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کا ادبی ذوق نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ ایسے واقعات اور تفصیلات کی بھی کمی نہیں جن سے خواجہ صاحب کی شعر دوستی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ فارسی کے بے شمار اشعار آپ کی نوک زبان پر رہتے تھے آپ یہ اشعار اس طرح موقع و محل کی مناسبت سے نقل کرتے تھے گویا فارسی کے یہ اشعار آپ ہی کے استعمال کیلئے کہے گئے ہوں اور یہ اشعار آپ کے ذہن میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے اور نقل و اقتباس کے منتظر رہتے ہوں

---

۱ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے فوائدالفواد کو چشتی سلسلۂ تصوف کا لایحۂ عمل قرار دیا ہے ملاحظہ کریں: ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی (اردو ترجمہ)

۲ فوائد الفواد کی تکمیل ۷۲۲-۱۳۲۲ ع میں ہوئی یعنی خواجہ نظام الدین اولیاء کے وصال سے صرف تین برس قبل۔

اس کے شواہد بھی موجود ہیں کہ خواجہ نظام الدین اولیاء خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بہر حال شعر آپ کی نظر میں حکمت کا درجہ رکھتا تھا۔ نظم و نثر کے بارے میں گفتگو کے دوران آپ نے نثر پر نظم کی فوقیت کو اس طرح واضح فرمایا کہ: ہر اچھی بات جو سنی جاتی ہے اس سے ذوق و لذت حاصل ہوتی ہے اور جو بات نثر میں کہی جائے، اگر اسی کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو اس سے لطف و اثر دوبالا ہوجاتا ہے۔[1]

شعر کے بارے میں یہ حسن ظن رکھنے والا یہ عظیم ہندوستانی عارف سعدی کے کلام کا بڑا دلدادہ تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے سعدی کے اشعار مجالس میں بارہا نقل کیئے اور سعدی کی غزلیات نے آپ کی مجالس سماع میں وجد و حال کی کیفیت بھی پیدا کی ہے۔

فوائد الفواد میں سعدی کا نام دوبار آتا ہے پہلی مرتبہ تو سعدی کا ذکر خود خواجہ صاحب نے کیا ہے اور سعدی کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے دوسری بار جامع فوائد الفواد حسن سجزی نے حضرت خواجہ صاحب کی گفتگو کی تائید میں سعدی کا ایک شعر پیش کیا اور آپ نے اس کی تعریف کی۔ فوائد الفواد میں پہلی مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء سعدیؒ شیرازی کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

بزبان ہر کہ خبر من برد حدیث عشقت چو معاملہ ندارد، سخن آشنا نباشد[2]

خواجہ صاحب اس موضوع پر کہ " وہ بات جو کسی بزرگ اور صاحب نعمت بزرگ سے سنی جائے اس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک مسجد کے امام صاحب صالح اور صاحب نعمت بزرگ تھے۔ نماز کے بعد مشائخ کے احوال و افکار بیان کرتے سننے والوں پر اس کا خاطر خواہ

---

١ اس سلسلے میں حضرت خواجہ کے ارشادات کیلئے ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ٤٢٣

٢ فوائد الفواد، اردو ترجمہ، مطبوعہ پاکستان، ص ١٠٥ یہ شعر کلیات سعدی مرتبہ فروغی میں پہلے مصرع کے اختلاف کیساتھ اسطرح نقل ہوا ہے:-

دگری ہمین حکایت بکند کہ من و لیکن چو معاملت ندارد سخن آشنا نباشد

اثر ہوتا۔ سامعین میں ایک شخص نابینا بھی تھــــا وہ بھی امام صاحب کی گفتگو سے محظوظ ہوتا۔ اتفاق کی بات ہے ایک روز امام صاحب موجود نہیں تھے۔ ان کی بجائے مسجد کے مؤذن صاحب نے امـام صـاحب کی روش ہی پر مشائخ کے حالات بیان کئے۔ جب اس نابینا شخص نے یہ گفتگو سنی تو پوچھا کہ آج کون تقریر کررہا ہے حاضرین میں سے کسی نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ نابینا شخص بولا کہ ہم ہر تردامن سے یہ کلمات نہیں سنیں گے۔ اس واقعہ کے بعد دوبارہ سماعت فرمائیے سعدی کا وہی شعر جس نے خواجہ صـاحب کے تصور و عقیدے کی تائید کی:

بزبان ہر کہ خبرمن برود حدیثِ عشقت   چو معاملہ ندارد، سخن آشنا نباشد

اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ اگر سعدی نے نہایت پر زور اور بلیغ انداز میں خواجہ صاحب کے عقیدے کی تائید کا اس شعر میں جواز فراہم کیا ہے تو دوسری طرف خواجہ صاحب کے اس شعر سے استنباط نے بھی خود سعدی کے تصور کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

فوائدالفواد میں دوسری بار سعدی کا ایک شــــعر جامع فوائدالفواد حسن سجزی دہلوی نے جو خود صاحب ذوق و استعداد شاعر ہیں اپنی طرف سے نقل کیا ہے۔ ہوا یوں کہ حضرت خواجـہ صـاحب نے حسن دہلوی کے اس استفسار پر کہ رویت خداوندی کی وہ نعمت جسکا مومنوں سے وعدہ کیا گیا ہے، کیا قیامت کے کے دن حاصل ہوجائیگی؟ حضرت خواجہ صاحب نے اس کی تصدیق کی[1] اور مزید وضـاحت کے طور فرمـایا کہ جب موس رویت خداو دی کی نعمت سے بہرہ یاب ہوں گے تو پھر کئی ہزار سال تک حیرت میں رہیں گے اور یہ کوتاہ نظری ہوگی اگر کوئی اس نعمت کے مشـاہدے کے بعد کسی اور چیز پر نگاہ ڈالے۔ خواجـہ صاحب کی اس مختصر تقریر کے بعد حسن دھلوی نے سعدی کا یہ شعر آپ کی خدمت

---

۱ قرآن الحکیم میں اسی طرف اشـارہ کیـا گیا ہے کہ وجوہٌ یومئذ ناصرة الیٰ ربھا ناظرة (ترجمہ: بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے (اور) اپنے پرودگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ سورہ قیامت آیت ۲۲)

میں پیش کیا جسمیں خواجہ صاحب کے خیال کی تصدیق و تائید کی گی ہے :

افسوس بران دیدہ کہ روی تو ندیدہ است یا دیدہ و بعد از تو بروئی نگریدہ است

خواجہ نظام الدین اولیا نے اس شعر کی داد دی اور کہا کہ شیخ سعدی نے خوب کہا ہے۔[۱]

حضرت خواجہ صاحب نے سعدی کا سب سے پہلا شعر جس مجلس میں نقل کیا ہے، اس کا انعقاد ۷۱۱ ہجری میں ہوا۔ سعدی کا انتقال ۶۹۰ ہجری یا ۶۹۶ ھجری میں بتایا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ سعدی کے انتقال کے صرف انیس بیس برس بعد ہی سعدی کے اشعار ہندوستانی مشائخ کے مجالس میں پڑھے اور سنے جانے لگے تھے یہ بات بھی اس ضمن میں یاد رہنی چاہیے کہ سعدی کے دیوان کا سب سے پہلا نسخہ ابن الفوطی نے سعدی کی رحلت کے ۳۵ برس بعد ترتیب دیا تھا۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی نہایت معنی خیز ہے کہ سعدی جنھیں فارسی ادب میں بنیادی طور پر صوفی شاعر نہیں سمجھا جاتا اپنی وفات کے صرف انیس بیس برس بعد ہی[۲] ہندوستانی مشاہخ کی مجالس میں نظر آتے ہیں، جبکہ مولانا روم جو سعدی سے لگ بھگ ۲۰ برس پہلے ۶۷۲ ہجری میں مثنوی معنوی جیسا تصوف کا ایک بنیادی اور اہم ماخذ نظم کرنے کے بعد رحلت کر گیے، ابھی تک ہندستانی مشایخ کی محفلوں اور مجالس میں راہ نہیں پاسکے۔ خود اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال سعدی کے انتقال کے انیس بیس برس بعد ہندوستان میں ان کے اشعار کی گونج تاریخی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔

فوائدالفواد کے بعد، سیر الاولیا میں بھی خواجہ نظام الدین اولیا کے احوال و افکار کا نسبتاً تفصیلی ذکر ملتا ہے چشتی مشایخ کے حالات و تعلیمات کے اس اہم ماخذ میں فارسی کے متعدد شعرا کے کلام سے نقل و اقتباس کیا گیا ہے۔ صاحب سیر الاولیا امر خورد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلام سعدی کے دیوانے تھے۔ انہوں

---

۱ فوائدالفواد ص ۳۵، یہ سعدی کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

۲ اگر مزید غور و فکر کیا جائے تو گمان غالب یہ ہے کہ اس فاصلے میں کمی ہوسکتی ہے یعنی سعدی کا کلام خود ان کی زندگی ہی میں ہندستان پہنچ گیا ہو، اس کا امکان ہے۔

نے کم از کم اسّی مرتبہ سعدی کے اشعار نقل کیے ہیں اور گلستان سعدی سے ایک حکایت بھی بیان کی ہے۔ امیر خورد اپنے بزرگ مشایخ کا ذکر کریں، انکے فضائل بیان کریں انکے واقعات نقل کریں، یا انکے عقائد و نظریات سے بحث کریں سعدی کے اشعار کی پیوندکاری سے چوکتے نہیں اور لگتا ایسا ہے گویا سعدی نے بھی امیر خواد کے ہر موضوع سخن کی تائید و تصدیق یا تشریح میں پہلے ہی سے اشعار کہدے تھے۔

خواجہ نظام الدین اولیا شیخ سعدی شیرازی کے کلام سے کس قدر لطف اندوز ہوتے تھے اس کی چند مثالیں سیر الاولیا میں بھی نظر آتی ہیں۔ امیر خورد نے اطلاع[1] دی ہے کہ ان کے گھر پر دعوت تھی سلطان المشائخ نظام الدین اولیا اور چند دیگر بزرگ اس دعوت میں شریک تھے۔ اس موقع پر محفل سماع بھی منعقد ہوئی۔ بہلول قوّال نے امیر حسن دہلوی کی ایک غزل گائی۔

حسن دہلوی کی اس غزل کے بعد امیر خسرو نے اپنی غزل پڑھنی شروع کی صرف مطلع ہی پڑھا تھا کہ رک گئے اور شیخ سعدی کی ایک غزل رقت آمیز لہجے میں پڑھی جس کا مطلع ہے:

معلّمت همه شوخی و دلبری آموخت جفا و ناز و عتاب و ستمگری آموخت

خسرو نے اپنی غزل شروع کی، لیکن صرف مطلع پڑھ کر سعدی کی یہ غزل شروع کردی۔ کیوں؟ خود خسرو سے جب اس کی وجہ پوچھی گی تو انہوں نے جواب دیا کہ جب میں اپنا کلام پڑھتا ہوں تو مجھ پر معانی کا اس قدر ہجوم ہوجاتا ہے کہ میں حیران رہ جاتا ہوں۔ کوئی سبب نہیں کے خسرو کے اس جواب کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اس کے باوجود خواہش یہ ہے کہ اس پہلو پربھی غور کیا جائے کہ مجلس سماع ہے۔ سلطان المشائخ چند دوسرے بزرگوں کے ہمراہ تشریف رکھتے ہیں خسرو کو غزل پڑھنی ہے خسرو پر سلطان المشایخ کے احسانات کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ خسرو کی زندگی کو ایک مخصوص اور ممتاز رنگ دینے کا سہرا سلطان المشایخ کے سر ہے۔ آپ نے خسرو کو حسن شاعری میں بھی اپنے مشوروں

۱ سیر الاولیا، اردو، ترجمہ، مطبوعہ پاکستان، ص ۴۷۶

سے نوازا تھا۔ امیر خورد نے سعدی کی غزل کا صرف مطلع نقل کیا ہے، لیکن جب اس غزل کے دوسرے اشعار پر نگاہ پڑتی ہے تو خسرو کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ خسرو نے محسوس کیا ہوگا اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کے پسندیدہ شاعر کی زبان سے اپنے احساسات تشکر و امتنان کا اظہار کریں۔ پیر و مرشد سے وابستگی کی نعمت نے ان کی زندگی میں جو عظیم انقلاب برپا کردیا تھا، اس کا اعتراف کریں، سلطان المشایخ کی چشم کرم نے خسرو کے دست طلب کو جو نعمتیں عطا کی تھیں ان کا شمار کریں اس پس منظر کیساتھ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

معلّمت ہم شوخی و دلبری آموخت — جفا و ناز و عتاب و ستمگری آموخت
هزار بلبل دستان سرای عاشق را — بباید از تو سخن گفتن دری آموخت
برفت رونق بازار آفتاب و قمر — از آنکه ره بدکان تو، مشتری آموخت
مرا بشاعری آموخت روزگار آنکه — که چشم مست تو دیدم که ساحری آموخت
بلای عشق تو بنیاد زهد و بیخ ورع — چنان بکند که صوفی، قلندری آموخت
دگر نه عزم سیاحت کند نه یاد وطن — کسی که بر سر کویت مجاوری آموخت
من آدمی بچنین شکل و قد و خوبی و روش — ندیده ام، مگر این شیوه از پری آموخت[1]

امیر خورد نے سعدی کے اشعار سے سلطان المشایخ پر خوشگوار اثرات کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے لکھتے ہیں: مجلس سماع منعقد تھی۔ خواجہ صاحب کسی تکلیف کی وجہ سے چار پائی پر تشریف رکھتے تھے۔ حسن قوال نے سعدی کا یہ مقطع پڑھا:

سعدی تو کیستی که در آئی درین کمند[2] — چندان فتاده اند که ماصید لاغرم[3]

اس مقطعے نے اتنا اثر کیا کہ سلطان المشایخ رونے میں مستغرق ہوگئے۔ آپ

---

۱ کلیات سعدی، ص ۱۸ (مرتبہ: عباس اقبال آشتیانی و محمد علی فروغی)۔
۲ یہ مصرعہ کلیات میں معمولی اختلاف کے ساتھ اس طرح نقل ہوا ہے:
سعدی تو کیستی که درین حلقهٔ کمند
۳ سیر الاولیا ص ۸۳

کا خادم خاص اقبال آپ کے سرھانے کھڑا تھا۔ وہ ایک باریک کپڑے سے رومال پھاڑ پھاڑ کر آپ کو دیتا رہا اور آپ کپڑے کے ان لکڑوں سے آنسو پوچھتے رہے اور حسن قوال کی طرف پھینکتے رہے۔ سعدی کی جس غزل کے اس مقطعے نے خواجہ صاحب گریہ و زاری طاری کیا، اس کے چند اشعار پیش کرنا بے جا نہ ہوگا چونکہ ظاہر ہے خواجہ صاحب کی طبیعت پر اس غزل کے شروع ہوتے ہی ایک تاثر پیــدا ہوا ہوگا۔ یہ تاثر، جذبہ یا حال اس مقطعے پر اپنے عروج کو پہنچا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بگذار تـا مقـــابلِ روی تو بگـذریم — وزدیـده در شمایل خوب تونبگـــرم
شوقــت در جدائی وجورست در نظـر — ہم جور بہ کے طاقت شوقت نیاوریم
روی ار بروی ماکنی حکم ازآن تـست — بـاز آ کہ روی درقـــامنت بگسترتم
گفتی زخـــاک بیشتر نداهل عشق من — از خاک بیشتر نہ کہ از خاک کمترتم
مابا تو ایم ویا تو نہ ایم، اینت بلعجب — در حلقہ ایم با تو و چون حلقہ بردریم
از دشمنـان برند شکایت بدوستـــان — چون دوست دشمنست، شکایت کجابریم
ماخود نمی رویم دوان از قفای کس — آن می بـرد کہ ما بکمند وی اندریم
سـعدی تو کیستی کہ درین حلقۂ کمند — چند ان فتادہ اند کہ ما صیدلا غریم

خواجہ نظام الدین اولیا پر یہ غزل سن کر جو عالم طاری ہوا، اسکی وضاحت کے لیے بھی امیر خورد نے خود سعدی ہی کا یہ قطعہ اقتباس کیا ہے۔

ناودانِ چشم رنجورانِ عشق — گـــر فروریزند، خون آید بجوی
شادباش ای مجلس روحانیان — تاخورند لین می کہ من ختم نبوی

حضرت نظام الدین اولیا کے ذہن میں عام طور پر سـعدی کے اشعار رہتے تھے۔ اس کا علم اس واقع سے ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کا معمول تھـا کہ آپ جمعہ کی نماز کے لیے کیلوکھڑی کی مسجد تشریف لے جاتے تھے۔ ایک بار گرمی کا موسم تھا۔ ایسی گرمی کہ بقول خواجہ نصیر الدین چراغ دھلی:
« ھوائی شہر دھلی درتابستان معلوم است، آتش می بارد، زمان زمان تشنگی اثرمی کند»

---

۱ کلیات سعدی، ص ۲۵۳

(ترجمہ: گرمی میں دہلی کے موسم کا حال معلوم ہے۔ آگ برستی ہے۔ گھڑی گھڑی پیاس لگتی ہے) ایسی ہی گرمی میں آپ ایک بار روزے سے تھے۔ جمعے کی نماز کے لئے کیلو کھڑی کی مسجد جارہے تھے۔ گرمی کی شدت اور روزے کی وجہ سے آپ کو چکر آنے لگے۔ آپ ایک دوکان پر بیٹھ گئے۔ اس وقت آپ کے دل میں خیال آیا کہ اگر کوئی سواری ہوتی تو اس پر سوار ہوکر جاتے۔ یہ خیال تصوف کے بنیادی اصول تسلیم رضا، اور قناعت وغیرہ کے منافی ہے فوراً سعدی کا یہ شعر آپ کے ذہن میں آیا:

ما قدم از سر کنیم در طلب دوستان   راہ بجایی نبرد هر که باقدام رفت[1]

سعدی کے اس شعر نے آپ کو تسلیم، رضا، قناعت، توکل وغیرہ کی یاد دلادی اور آپ کسی سواری کے دستیاب نہ ہونے کے باوجود مطمئن ہوگئے۔

نظام الدین اولیا کا سعدی کے کلام سے والہانہ تعلق تھا۔ غالباً یہ تعلق آخری عمر تک برقرار رہا اور خواجہ صاحب کے وصال کے بعد جب آپ کا جنازہ دفن کے لیے جایا جارہا تھا تو ایک روایت کے مطابق قوال شیخ سعدی کی ایک غزل پڑھ رہے تھے جس کا مطلع ہے:

سرو سیمینا بصحرا می روی   نیک بدعهدی که بی ما میروی

اس طرح ہندوستان کے جس عظیم المرتبت عارف نے عمر بھر شیخ سعدی کے کلام پر سر دھنا، اسے بار بار توجہ کے قابل سمجھا، اس کے وصال کے بعد اس کے چاہنے والوں نے، اس کے مزاج شناس پیرو کاروں نے اسکے جسد خاکی کو سعدی کے غزل کی مترنم گونج کے زیر سایہ قبر میں ابدی نیند کی آغوش کے سپرد کردیا۔

---

۱ خیر المجالس، مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص ۷۰

Edited by Dr Nizamuddin S. Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director, Anjuman - i - Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Mr Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary, Anjuman - i - Islam, Bombay 400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400 008

کتابی دنیا

ڈاکٹر یونس اگاسکر
(تبصرہ نگار)

اردو کی لسانی تشکیل

اُردو میں لسانیاتی تحقیق کا دایرہ روز بہ روز وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ ایک عرصے تک ہمارے اساتذہ زیادہ تر ڈاکٹر محی الدین زور کی "ہندوستانی لسانیات" ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" ڈاکٹر شوکت سبزواری کی "اُردو زبان کا ارتقا" اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی "مقدمۂ تاریخ زبان اردو" ہی کو اردو لسانیات کی کاینات سمجھ کر پڑھتے پڑھاتے رہے۔ اِن کتابوں میں تاریخی لسانیات کے تناظر میں اردو کے آغاز و ارتقا کے جغرافیائی و تاریخی عوامل و اسباب کی تلاش کی گئی ہے ڈاکٹر شیرانی نے سب سے پہلے داخلی شہادتوں کے ذریعے اردو کے عہد بہ عہد ارتقا کے حدود متعین کیے۔ اُن کے بعد دیگر ماہرینِ لسانیات نے زبان کے قدیم نمونوں کے پیشِ نظر نتائج اخذ کرنے کے سلسلے کو دراز تر کردیا ان بزرگوں کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی کے مترادف ہے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "لسانی مسائل" اور "اردو لسانیات" کے ذریعے طلبہ کو لسانیات کی طرف راغب کرنے میں بڑا حصہ ہے اس ضمن میں دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے جریدہ "اردوے معلّیٰ" کے "لسانیات نمبر" کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ اُن نوجوان محققین میں سے ہیں جنھوں نے لسانیات

میں تخصص کیا ہے اور اس موضوع کے تقاضوں کو پورا کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں۔ اُردو زبان کے آغاز اور عہد بہ عہد ارتقا کو جدید و قدیم لسانی و صوتیاتی خصوصیات کی روشنی میں لکھے گئے آٹھ تحقیقی مقالات پر مشتمل اُن کی تازہ تصنیف «اردو کی لسانی تشکیل» ان کی سخت کوشی اور عملی لگن کا عمدہ نمونہ ہے۔ زیر نظر کتاب میں موصوف نے شمالی ہند میں اردو زبان و ادب کی تشکیل کا تاریخی و صوتیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ مضامین ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کے تحت لکھے گئے ہیں مگر ان میں اردو کے نامور محققین اور ماہرین لسانیات کے مختلف النوع نظریات اور نتائجِ فکر سے بھی مفصل بحث کی گئی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کو بہ دلائل واضح و ثابت کیا گیا ہے۔

مصنف کی رائے میں اُردو زبان شورسینی اَپ بھرنش سے نکلی ہے اور اس کا ارتقا مسلمانوں کے دور سے دو سو سال قبل ہی شروع ہوچکا تھا۔ مسلمانوں کی آمد نے محض اس کی رفتارِ ترقی کو تیز تر کردیا لیکن مسلمانوں نے ہندوستان پر قابض ہوجانے کے باوجود ابتدا میں اس کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ انھیں اس کے سیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی البتہ ہندوؤں نے نے جب فارسی سیکھی تو اپنی بول چال کی زبان میں فارسی الفاظ اور تراکیب استعمال کرنی شروع کیں جن سے ان کی زبان ابھرنے اور نکھرنے لگی۔ ان کی زبان کا ابھار اور نکھار اُردو کا اُبھار اور نکھار قرار پایا۔ لہٰذا اردو کا ابتدائی لسانی ارتقا مسلمانوں کا نہیں بلکہ ہندوؤں کا مرہونِ منت ہے۔ البتہ اسے ترقی یافتہ بنانے اور اسے ادبی و علمی مرتبے تک پہنچانے میں مسلمانوں نے ایک نمایاں اور مہتم بالشان کردار ادا کیا ہے۔

کتاب کے اولین دو مقالے «اردو کے آغاز اور ارتقا کے نظریے» اور «اُردو کا ادبی و لسانی ارتقا شمالی ہند میں» کلیدی حیثیت رکھتے ہیں ان میں مصنف نے اپنے زاویۂ نظر کو پُر زور طریقے پر دہرایا ہے لیکن اردو کے باقاعدہ آغاز کو موصوف نے مسلمانوں کی فتح دہلی کی تاریخ ۱۱۹۳ء سے منسوب کیا ہے زبان کے مسلسل ارتقا کے پیش نظر ان کا کسی ایک سنہ کو معیاری زبان کا سال

آغاز ماننا کھٹکتا ہے۔ انہوں نے گیارھویں اور بارھویں صدی (۱۰۰۰ تا ۱۱۹۳ع) کے دوران ابھرنے والی زبان کو پیش اردو کے نام سے یاد کیا ہے۔ اردو کا ادبی و لسانی ارتقا میں غالباً پہلی مرتبہ ادب کے عہد بہ عہد ارتقا کا اس قدر تفصیل سے لسانی جایزہ لیا گیا ہے۔

«اردو کی معکوسی آوازیں» اور «سترھویں صدی کی اردو: چند صوتیاتی خصوصیات» سائنسی و معروضی انداز میں لکھے گئے مقالے ہیں۔ ان میں جدید لسانیات کی روشنی میں اردو کا صوتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ البتہ تحریری مواد سے صوتیاتی نتائج اخذ کرتے ہوئے کہیں کہیں تکنیک سے دامن بچانا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

«قدیم اردو اور ہریانی میں ژول بلوک ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور اور پروفیسر مسعود حسین خان کا اس خیال کی تائید میں قدیم اردو پر ہریانی کا خاصا اثر پایا جاتا ہے۔ دکنی اور ہریانی میں پائے جانے والی دلچسپ مماثلتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

«قدیم اردو کا سرمایۂ الفاظ» میں اردو کے تت سم۔ تدبھو اور دیسی الفاظ اور صوتی خصوصیات کا جایزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح «اردو رسم خط اور املا میں ان دونوں کے تاریخی ارتقا اور تغیرات کا مخطوطات کی روشنی میں احاطہ کیا گیا ہے۔

«اردو کی لسانی تشکیل» اردو کے ذخیرۂ تاریخی لسانیات میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ایک تربیت یافتہ ماہر لسانیات ہیں مگر انہوں نے اپنی تحریروں میں اس بے جا تفخر کو در آنے کا موقع نہیں دیا ہے جو عموماً ہمارے «ماہرین لسانیات» کی گفتگو اور تحریر کا خاصہ ہوتا ہے۔ ان کا انداز بیان فہمائشی اور شگفتہ ہے اور اسی لیے ان کے دلائل دل کو چھونے لگتے ہیں۔

اردو کی لسانی تشکیل مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
قیمت: ۴۵ روپے

مقالہ نما

مذہبیات

ڈاکٹر ع ص ابراہیمی

جناب شیخ احمد احسائی کے علمی کارنامے

ماہنامہ شاداب حیدر آباد مئی ۱۹۸۷ع
جلد ۴، شمارہ ۵، ص ۴۲-۴۵

حضرت شیخ احمد احسائی مرحوم بزرگ ترین علمائے شیعہ اثناء عشری میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کی ولادت ماہ رجب ۱۱۶۶ھ میں بمقام قریہ مطیرفی میں ہوئی جو قصبہ احساء بلاد عرب ایک حصہ ہے۔ آپ کے پدر بزرگوار زین الدین بن ابراہیم بن صقر بن داغر تھے یہ سب حضرات مذہب امامیہ کے پابند تھے۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز شیخ محمد بن شیخ محسن کی تلمیذ سے ہوا اسکے بعد آقا محمد باقر بہبہانی اور آقا سید مہدی طباطبائی کی محافل درس میں حاضر ہوئے مختلف مقامات پر سکونت اختیار فرمائی ۱۲۴۱ قمری میں مشہد مقدس اور اصفہان کے سفر کے بعد کرمان شاہ سے بعزم حج سفر کرتے ہوئے مدینہ سے دور منزل ہدیہ نامی قریہ میں آپ نے اس جہان فانی سے کوچ فرمایا۔ آپ کی قبر جنت البقیع میں چار ائمہ اطہار کے مزارات مقدس سے قریب میں واقع ہے آپ کی اولاد (۱۷) فرزندوں اور گیارہ دختروں پر مشتمل ہے اپنی حیات میں آپ نے فقہ، اصول اور حکمت الہی کے موضوع پر جملہ ایک سو بتیس کتابیں لکھی ہیں ان میں سے بعض طبع بھی ہوچکی ہیں ان میں مشہور ترین کتابیں شرح

زیارت، جامع کبیرہ، شرح فوائد، شرح عرشیہ، اور شرح مشاعر ہیں۔

خواجہ حمید احمد

کٹل منڈی (حیدر آباد دکن) کا
آفتاب چند - شعاعیں

ماہنامہ شاداب حیدر آباد مارچ ۱۹۸۷ع
جلد ۴، شمارہ ۳، ص ۱۳-۱۵

حیدر آباد کے محلہ کٹل منڈی میں ڈاکٹر حمید اللہ کا آبائی گھر ہے۔ اس محلہ میں حضرت حبیب علی شاہ کی درگاہ اور اور مسجد واقع ہے اس درگاہ کی ایک جانب جنوب میں حمید اللہ صاحب کا مکان ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اسکول کی زندگی دارالعلوم میں بسر ہوئی اور اعلیٰ تعلیم عثمانیہ کالج میں حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ سے قانون میں L. L. B. کی ڈگری حاصل کی اور فقہ میں ایم اے کیا حمید اللہ صاحب نے اپنے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سیاسی مجاہدوں میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔

اپنے زور قلم سے قرآن مجید کا ترجمہ یورپی زبانوں میں کرکے قلمی جہاد کو اپنی جدو جہد کا وسیلہ بنایا ہے اب اس کے نتائج اظہر من الشمس ہورہے ہیں۔

سید مظفر حسین برنی

عربی زبان و ادب میں ہندوستانی علما
کا حصہ

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۸۷ع
جلد ۱۳۹ شمارہ ٦ ص ۴۲۵-۴۲۷

منقولات و معقولات کی ہر شاخ میں ہندوستانی علما نے اپنی ذہانتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔

لغت میں رضی الدین حسن صغانی کی کی نہایت ضخیم کتاب العباب الزاخر بیس جلدوں میں صرف ب × گ × م = بکم تک پہنچی تھی۔ انکی تصانیف دو درجن سے بھی زیادہ ہیں۔ انکا ایک زندہ جاوید کارنامہ حدیث نبوی کا مجموعہ «مشارق الانوار» ہے۔

حدیث کی دوسری کتاب «کنز العمال» ہے جسکے مرتب شیخ علاء الدین علی متقی برہانپوری ہیں فن حدیث میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ دہلوی، نواب صدیق حسن خان حضرت عبد اللہ شاہ نقشبندی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی خدمات کسی طرح علمائے خطۂ عرب سے کم نہیں۔

ڈاکٹر عبداللطیف

مترجم: نعمان اللہ فاروقی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط امراء و سلاطین کے نام

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۸۷ء جلد ۱۳۹ شمارہ ۴، ص ۲۶۱-۲۸۸

مئی ۱۹۸۷ء جلد ۱۳۹ شمارہ ۵ ص ۳۴۳-۳۶۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خطوط کی تعداد کے بارے میں بہت اختلاف ہے جو آپ نے سلاطین و امراء اور روسا کے نام تبلیغ اسلام کی غرض سے مخصوص قاصدوں کے ذریعے روانہ فرمائے تھے آپ نے مخصوص قاصدوں کا انتخاب کس طرح فرمائے تھے ان خطوط کے جوابات آپ کو کیا ملے۔ آپ کے سفراء کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ یہ اور دوسرے بہت سے اہم سوالات ہیں جن کا جواب حقائق اور دلائل کی روشنی میں مقالہ ہذا میں دیا گیا ہے۔

ادبیات

ڈاکٹر شمیم اختر صاحبہ

راجہ رام نارائن موزوں اور انکا کلام

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۸۷ء جلد ۱۳۹، شمارہ ۱، ص ۶۰-۷۵

راجہ رام نارائن کے وارث راجہ درگا پرشاد المتخلص بہ شاہ عظیم آبادی جب دیوان موزوں مرتب کرکے ۱۲۸۷ھ میں شائع کیا تو اس میں انکا مختصر تذکرہ بھی شامل کردیا اس میں موزوں اور ان کے ورثا کا ذکر تو ہے لیکن انکی جائے پیدائش سن ولادت اور انکے والد کا نام تک تحریر نہیں ہے۔

بتقاضائے زمانہ رام نارائن کی تدریس و تعلیم بھی فارسی زبان کے ذریعے ہوئی انہیں فارسی علم و ادب سے خاص شغف تھا اور انکا ذوق شعری بلند اور پاکیزہ تھا چنانچہ انہوں نے استاد کیلئے فخر المتاخرین شیخ محمد علی حزیں کو منتخب کیا اور استاد نے بلحاظ موزونی طبع انہیں "موزوں" کا تخلص عطا کیا۔

انہیں فی البدیہہ شعر گوئی میں مہارت حاصل تھی۔

نظر برنی

مولانا محمد علی کے تعلیمی نظریات

ماہنامہ شاداب حیدر آباد ہند مئی ۱۹۸۷ء جلد ۳ شمارہ ۵ ص ۱۸-۲۳ قسط دوم

مولانا محمد علی نے بمقدرہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں قومی تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ جامعہ نے میں ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خدا پرست اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں۔

دینی تعلیم کے علاوہ جس بات پر توجہ دی وہ ذریعہ تعلیم کی زبان ہے مولانا نے اپنے نصاب میں ادب تاریخ و فلسفہ کے ساتھ ساتھ سائنس اور تکنیک کو بھی اہم مضامین کے طور پر رائج کرنے کی تجویز رکھی

مولوی سید محمد ضیاء الدین شمسی طہرانی

ابو الفضل بیہقی مورخ اور فارسی نثر نگار کی حیثیت سے

ماہنامہ برہان دہلی، مارچ ۱۹۸۷ء
جلد ۹۹، شمارہ ۳، ص ۱۳۶ - ۱۴۸

تاریخ بیہقی کے مصنف کا پورا نام ابو الفضل محمد بن الحسین البیہقی الکاتب ہے۔ تذکرہ نگاروں نے «الکاتب» اسلئے لکھا ہے کہ وہ انیس سال تک غزنوی سلاطین کے دیوان رسائل کا منشی رہا ہے اسکی ولادت بیہق کے کسی قریہ میں ہوئی سنہ ولادت ۳۸۵ھ ہے۔

بیہقی نے آل غزنین کی تاریخ تیس جلدوں میں لکھی ہے انکی چند جلدیں (ناقص) باقی رہ گئی ہیں ایک اور کتاب بھی اسکے نام سے منسوب ہے جسکا نام زینۃ الکتاب ہے یہ کتاب فن کتابت وانشاء سے متعلق ہے۔

تاریخ نویسی کے متعلق جو فن وفلسفہ ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق «مقدمہ» میں پیش کیا ہے بیہقی نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

ارتضی کریم

طلسم ہوشربا اور داستان کی تنقید

ماہنامہ آجکل نئی دہلی، مئی ۱۹۸۷ء
جلد ۴۵ شمارہ ۱۰ ص ۱۶ - ۴۲

تنقید کے کسی بھی اسکول نے داستان کی طرف توجہ نہ کی حتی کہ ترقی پسند ناقد نے بھی شاید اسلئے داستان کی طرف توجہ نہ کی حتی کے ترقی پسند ناقدین نے بھی شاید اسلئے داستان کی طرف نہ دیکھا کہ وہ اسے تفریح وتفنن اور نشاط و انبساط کی چیز سمجھتے حالانکہ مارکسی حکمت میں یہ شعور موجود تھا کہ کسی بھی دور کا ادب اپنی دور کی سچائیوں کو پنہاں یا برملا انداز سے پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر وہاب معصوم رضا نے اس فلسفے کو سمجھا اور اپنی تنقید میں اس سے بڑا کام لیا۔ "طلسم ہوشربا۔ ایک مطالعہ" کے بنظر غائر مطالعہ سے پہلی رائے یہ بنتی ہے کہ اردو میں پہلی بار کسی ایک داستان پر کسی نقاد نے اپنی تنقیدی صلاحیت صرف کی۔ اسکی جزئیات سے تفصیلی اور تنقیدی بحث کی ہے۔ یہاں تحقیقی گفتگو ہے اور تنقیدی مباحث بھی تحقیقی سطح پر انہوں نے طلسم ہوشربا کے مصنف کے سلسلہ میں گیان چند جین اور شرر کی تحقیق کو رد کیا ہے تو تنقیدی اعتبار سے اس داستان کی زمین پر ہندوستان اور لکھنؤ کی تہذیب کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

اختر کے فارسی دیوان کا ایک
نادر مخطوطہ

ماہنامہ برہان دہلی جولائی ۱۹۸۷ء
جلد ۱۰۰ شمارہ ۱، ص ۱۹-۲۹

قاضی محمد صادق خاں متخلص به اختر انیسویں صدی کے ایک اہم اور نامور فارسی شاعر و ادیب تھے وہ ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء میں بنگال (کلکتہ) میں پیدا ہوئے۔

قاضی اختر نے ایک تذکرہ آفتاب عالمتاب ترتیب دیا ہے جس میں اوائل سے اپنے دور تک فارسی شعرا کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

قاضی محمد صادق اختر کثیر التصانیف ادیب و شاعر تھے۔ عربی و فارسی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ انکی متعدد تصانیف آج بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں ان میں سے بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔ اردو شاعری کے نمونے بھی دستیاب ہیں۔

قاضی اختر کا ایک نامکمل فارسی دیوان ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اسمیں صرف غزلیات ہیں جو ردیف کے لحاظ سے حروف تہجی کے مطابق مرتب کی گئی ہیں۔ یہ دیوان اواخر تیرھویں صدی ہجری انیسویں صدی عیسوی میں خط نستعلیق میں کتابت ہوا ہے اس میں ۵۵ ورق ہیں کچھ اوراق سادے بھی چھوڑ دیئے گئے ہیں اسکا سائز ۶۰۷۵×۱۰۰۲۵ انچ (؟) ہے۔

اس دیوان سے انکے سادہ سلیس رواں اور دلکش اسلوب کا پتا چلتا ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام

ماہنامہ جواز مالیگاؤں، مارچ ۱۹۸۶ء
فروری ۱۹۸۷ء جلد ۱۰ شمارہ ۲۳
ص ۳۷ ـ ۳۶

یہ حقیقت ہے کہ فیض نے اردو شاعری میں نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے نئے اظہاری پیمانے وضع کئے اور سینکڑوں لفظوں، ترکیبوں اور اظہاری سانچوں کو کو ان کے صدیوں پرانے مفاہیم سے ہٹا کر بالکل نئے معنیاتی نظام کیلئے برتا اور اظہاری پیرائے اور ان سے پیدا ہونے والا معنیاتی نظام بڑی حد تک فیض کا اپنا ہے۔

انکی لفظیات کلاسیکی روایت کی لفظیات ہے لیکن اپنی جادوئی لمس سے سے وہ کس طرح نئے معنی تخلیق کرتے ہیں یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

علیہ یاسمین

ادب اور صحافت

ماہنامہ شاداب حیدر آباد ہند، مارچ
۱۹۸۷ء جلد ۲ شمارہ ۳ ص ۳۵ ـ ۴۱

گو ادب اور صحافت الگ الگ صنف سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ اصناف ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی مربوط ہیں ہم انکے درمیان نہ تو کوئی واضح حد بندی قائم کرسکتے ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مشترکہ خصوصیات ہونے کے باوجود ان میں بنیادی فرق موجود ہے۔ ادب کو ہم ذاتی خیالات و افکار کا نمونہ قرار دیتے ہیں جبکہ صحافی اپنے طبقے یا اپنی کمیونٹی کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے ادب کم حقیقت پسند، تخیلی اور آئیڈیل ہوتا ہے جبکہ صحافت میں حقیقت پسندی اور واقعات کی تعبیر و تشریح کی جاتی ہے صحافت کو ایک "تیز رو ادب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ صحافت میں وقت اور موقع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جبکہ ادب زمان و مکان سے ماوراء ہوتا ہے۔

صحافت میں خفت و اختصار لازمی ہے اور مبالغہ آرائی کی گنجائش نہیں ہے جبکہ ادب میں مواد کے علاوہ حاشیہ آرائی، مبالغہ آرائی، تخیل زبان و بیان، اسلوب نگارش اور عبارت آرائی کی ادب میں داخلیت ہوتی ہے صحافت میں حالات کی تازگی اور ہنگامیت بنیادی شرط ہے۔

صحافت واقعات کا اظہار ہے اور ادب واقعات کو خیالات میں تبدیل کرنے کا نام ہے۔

شخصیات

محمد کلیم اللہ احسن

قائد ملت بہادر یار جنگ

ماہنامہ شاداب حیدر آباد پٹنہ
مارچ ۱۹۸۷ع جلد ۴ شمارہ ۳ ص ۵-۱۲

محمد بہادر خان ۳ جنوری ۱۹۰۵ع کو شہر حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ مفید الانام اور دارالعلوم میں ہوئی میٹرک کا امتحان دینے سے قبل ہی سلسلۂ تعلیم منقطع ہوگیا۔ ۱۹۲۱ع میں حج کی سعادت حاصل کی اور بلاد اسلامیہ کا چھ ماہ تک دورہ کرتے ہوئے اسلامی ممالک اور مسلمانان عالم کی سیاسی مذہبی، اقتصادی، عمرانی اور معاشرتی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ انکی غفلت و پستی کے اسباب پر نظر ڈالی۔

۱۹۲۷ع میں مجلس تبلیغ اسلام قائم کی ۲۲ مئی ۱۹۲۸ع کو بمقام بمبئی آل انڈیا تبلیغ اسلام کانفرنس کے اجلاس چہارم کی صدارت کی۔ مطالعہ انکا کافی وسیع تھا۔ روزانہ دو ڈھائی سو صفحات کا مطالعہ کرتے انکا کتب خانہ بھی بہت وسیع تھا۔ اردو کے علاوہ عربی فارسی، اور انگریزی میں بھی انکی مہارت مسلمہ تھی نواب بہادر خان صحافی نہ ہونے کے باوجود دنیا کے بڑے بڑے صحافی سے زیادہ اس فن پر عبور رکھتے تھے۔ فن خطابت کے ماہر تھے اور اسی لئے وہ «لسان الامت» کہلائے۔

مہدی عباس حسینی

فنکار و فقیر صادقین

ماہنامہ آجکل نئی دہلی مارچ ۱۹۸۷ع
جلد ۴۵ شمارہ، ۸، ص ۱۴-۲۷

سید صادقین احمد نقوی ولد سید سبطین احمد نقوی ۱۹۳۰ع میں امروہہ اتر پردیش، ہندوستان میں پیدا ہوئے امام المدارس ہائی اسکول امروہہ سے ہائی اسکول پاس کیا۔ بی اے پرائیویٹ طور پر آگرہ یونیورسٹی سے کیا۔

۱۹۵۴ع میں صادقین کی تصویروں کی پہلی نمائش منعقد ہوئی۔ صادقین کی ہمہ جہت شخصیت کے تین پہلو اُن کے فن پاروں میں خاصکر ابھر آئے ہیں۔ ہم انہیں تلاش ذات، بکرنۂ آگہی اور جہد مسلسل

کہہ سکتے ہیں۔

مصورانہ خطاطی میں بھی انہوں نے روایت سے بغاوت کرکے نئی راہیں کھولیں انہوں نے مروج خطوط و دوائر کو پس پشت ڈالدیا۔

رمن راج سکسینہ

ڈاکٹر زور ـــ ایک یادگار زمانہ شخصیت

سب رس حیدرآباد، جلد ۵۰ شمارہ ۳
مارچ ۸۷ء ص ۴۵-۴۸

بیسویں صدی کی ربع اول کی ممتاز دکنی شخصیتوں میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا شمار کیا جاسکتا ہے انہیں دکن کی ہر چیز سے پیار تھا ان کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ علی سانگڑے سلطان سے جاملتا ہے۔ انکی پہلی تصنیف "روح تنقید" بیس اکیس سال کی عمر میں وجود میں آئی۔

ڈاکٹر زور نے اپنی مختصر دور حیات میں وہ کام سر انجام دے ہیں جو شاید ایک انجمن سے بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ نہیں سکتے تھے۔

مفرقات

بسلمل نسیم احمد

لفظ "ادب" کی تاریخ کا تجزیہ

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۷ء
جلد ۱۲۹ شمارہ ۳ ص ۲۲۵ - ۲۳۳

زمانہ جاہلیت سے بہت پہلے کی اور ابکی ادبی تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ لفظ ادب کے قدیم ترین معنی وہی تھے جو لفظ "سنّت" کے ہیں یعنی عادت طرز عمل یا وہ طریقہ جو آدمی وراثت میں پاتے۔ والرز اور نالینو کے خیال میں لفظ "ادب" لفظ "داب" کا صیغہ جمع ہے اور داب کے معنی عادت یا طرز عمل ہے۔

عباسی دور کے اوائل میں لفظ "ادب" لاطینی لفظ "ربتیاس" کا ہم معنی تھا اور اور ربتیاس کے معنی تھے شہری زندگی کی عمدگی۔

عشرت پسندی اور اخلاق حسنہ اسلامی تہذیب کے پورے وسطی دور کے دوران لفظ ادب کے یہی معنی سمجھے جاتے تھے۔

جہاں تک معنوی ارتقا کا تعلق ہے یہ فرانسیسی لفظ لٹریچر کے ہم معنی ہو گیا جسکا اطلاق ایسی تحریر پر ہوتا ہے جو

زبان کی حدود کے اندر فکر عمیق اور نگاہ حساس کے نتیجے میں قلمبند کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر حسن آرزو

امیر خسرو — فلک الافلاک کا ماہر

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۷ع جلد ۳-۱۳۹ ص ۲۰۳ - ۲۱۴

مثنوی « نہ سپہر » کا ڈھانچہ علم نجوم کے نہ افلاک پر قائم کیا گیا ہے۔ نہ افلاک دراصل فلک الافلاک نظام بہت حکیم بطلیموس سے ماخوذ ہے۔

مثنوی نہ سپہر کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ وہ عظیم شخصیت تھی کہ جس کو بقول خود خسرو ستارہ زحل نے ہی نت نئی اختراعات و ایجادات سکھائی تھیں بلکہ اسکے قدموں میں ایک طرف قدرت نے زہرا و مشتری کو ڈال دیا تھا تو دوسری طرف اس نے خود بڑھ کر ستارہ عطارد کو مسخر کرلیا تھا۔

ڈاکٹر مغنی تبسم

وجہی کا فلسفۂ زیست

سب رس حیدر آباد جلد ۵۰ شمارہ ۳ مارچ ۱۹۸۷ع ص ۴۰ - ۴۴

مثلاً وجہی « سب رس » میں روزمرہ زندگی کے معمولات سے لے کر مابعدالطبیعیاتی مسائل تک بے شمار امور پر قلم اٹھایا ہے۔ اس نے اپنے تجربات کو بڑی خوش فکری و ذہانت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وجہی جب حیات و کاینات کی حقیقت پر غور کرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کاینات کی تخلیق عشق سے عشق کے لیے ہوئی ہے۔ اس کے نزدیک عشق کا تصور حرکی ہے۔ وہ اسے خلاق قا حسن سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان کی عظمت کا بھی قائل ہے۔

شمس الحسن

شیخ علی حزیں کے ناقدین کی غلط فہمیاں

سب رس حیدر آباد جلد ۵۰، شمارہ ۱ جنوری ۱۹۸۷ع ص ۳۱-۴۱

عہد محمد شاہی کے ایک اہم فارسی گو شاعر شیخ علیؒ حزیں ایک بزرگ عالم دین اور روحانی پیشوا تھے۔ مختلف شہروں کی خاک چھانتے ہوئے ہندوستان آئے۔ دلی میں ۱۴ سال قیام کے بعد لکھنؤ ہوتے ہوئے بنارس پہنچے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں ۶۷-۱۷۶۶ع میں انتقال کیا۔

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

لغات گجری (مرتبہ)
رقعات عالمگیر (مرتبہ)
مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
سوراج (ترجمہ)
رہنمائے صحت (ترجمہ)
ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر ظہور الدین مدنی

ولی گجراتی (مؤلفہ)
نورالمعرفت (مرتبہ)
غزل ولی تک (مولفہ)
اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
نوائے وقت (مولفہ)
گلمپسز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
طوطیان ہند (مرتبہ)
انڈو ایرانین ریلیشنز کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)
انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ)

عبدالرزاق قریشی

نوائے آزادی (مرتبہ)
مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
مبادیات تحقیق (مولفہ)
راگ مالا (مولفہ)

نقلیں اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری
مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
مقالہ نما مرتبہ رفیہ انعامدار

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کمیٹی

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

•

چیرمن

جناب مصطفیٰ فقیہ

•

سیکرٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

اراکین

جناب عبدالمجید ای پالکا　　جناب عبدالستار زری والا

پروفیسر عبدالقادر قاضی

• • •

انجمن اسلام کی مجلس عاملہ

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

•

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب مصطفیٰ فقیہ	محترمہ ہمایوں پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی
جائنٹ سیکرٹری	اعزازی جنرل سیکرٹری	جائنٹ سیکرٹری
جناب یوسف مراد	جناب عبدالمجید ای پالکا	جناب ستار زری والا

اراکین

جناب کے ضیاءالدین	محترمہ زلیخا مرچنٹ	جناب عبدالستار عمر
جناب احمد آر پیر محمد	جناب مامون لقمانی	جناب فیض جسدن والا
پروفیسر عبدالقادر قاضی	ڈاکٹر علی محمد یو میمن	پروفیسر نظام الدین گوریکر

• • • •

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی　(۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸ء)

پروفیسر سید ظہیرالدین مدنی　(۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴ء)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر　(۱۹۷۵ سے جاری)

REGISTRATION NO. : 32008/69

NAWA-E-ADAB

(BIANNUAL)

VOLUME : XXXVII
OCTOBER
1987

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Dadabhoy Naoroji Road, Bombay [illegible]